اکتوبر ۲۰۱۵ء ذوالحجہ/محرم ۱۴۳۶/۱۴۳۷ھ

فکری، اصلاحی، دینی مجلہ

ماہنامہ

جلد ۱

شمارہ ۴

حوصلہ

MONTHLY HOSLA

امن کی خواہش درست!
مگر راہِ امن کے انتخاب سے انکار کیوں؟

★ وضو کی حکمتیں اور اس کے فوائد ★ زبان کی حفاظت پر جنت کی ضمانت ★ سیدنا حضرت عثمانؓ بن عفان ★

مغرب کا فکری اتار چڑھاؤ اور راہِ اعتدال!
ایک طائرانہ جائزہ!

اسلام کا آفاقی نظام
ایک مختصر تعارف

آیئے پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کریں!
ایک چونکا دینے والی تحریر

شامی افواج کی سپہ سالاری سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی
اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے تقرر کے سلسلہ میں لکھا گیا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبداللہ عمرؓ امیر المومنین کی طرف سے ابوعبیدہ بن جراح کو" سلام علیک"
میں خدا کا سپاسگزار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں،
تمہیں معلوم ہو کہ "ابو بکر صدیقؓ" جانشین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔
خدا کی رحمتیں اور برکتیں ہوں ابو بکرؓ پر جو صحیح کام کرنے والے، انصاف پسند، جائز مواخذہ کرنے والے، نرم مزاج، پاکباز، متواضع اور دانا تھے، میں اپنی اور سارے مسلمانوں کی اس مصیبت سے اجر خیر کا طالب ہوں، میری خواہش ہے کہ تقوی کے ذریعہ گناہ اور برائی سے بچ کر خدا کی رحمت کا مستحق بنوں، جب تک زندہ ہوں اس کی اطاعت میں لگا رہوں مرنے کے بعد جنت سے بہرہ ور ہوں، بے شک خدا ہر بات پر قادر ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم نے دمشق کا محاصرہ کرلیا ہے،
میں نے تمہیں مسلمانوں کا سالار اعلیٰ مقرر کیا ہے،
حمص اور دمشق کے نواحی، نیز شام کے دوسرے علاقوں میں رسالے پھیلا دو،
لیکن اس معاملے میں اپنی اور دوسرے مسلمانوں کی رائے سے بھی کام لو،
صرف میرے لکھنے سے اپنا لشکر خطرہ میں نہ ڈالو،
جس سے دشمن کو تمہیں نقصان پہنچانے کا حوصلہ ہو۔
جو لوگ تمہارے پاس زائد ہوں انہیں میرے پاس بھیج دو
اور جو محاصرہ میں تمہارے لئے ضروری ہوں انہیں اپنے پاس رکھو،
خالد بن ولیدؓ کو بھی روک لو کیونکہ ان کے بغیر تمہارا کام نہیں چل سکتا"۔

بحوالہ (تہذیب تاریخ دمشق، ابن عساکر۔ ۱،۱۵۱)

نومبر ۲۰۱۵ء ذوالحج محرم ۱۴۳۶ھ

فکری، اصلاحی، دینی مجلہ

ماھنامہ

حوصلہ

جلد ۱
شمارہ ۴

MONTHLY HOSLA

صفحاتِ مجلّہ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَالَا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ (اسلامی) حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدِّ باب کر دیتے ہیں جن کا سدِّ باب قرآن سے نہیں کرتے۔

(تفسیر ابن کثیر، ج ۳ ص ۵۹، البدایہ والنہایہ، ج ۲ ص ۱۰، کنز العمال)

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

اَلْاِسْلَامُ وَالسُّلْطَانُ اَخَوَانِ تَوَامَانِ لَا یَصْلَحُ وَاحِدٌ مِّنْھُمَا اِلَّا بِصَاحِبٍ فَالْاِسْلَامُ اُسٌّ وَالسُّلْطَانُ حَارِسٌ وَمَالَا اُسٍّ لَہٗ یَھْدِمُ وَمَالَا حَارِسٌ لَہٗ ضَائِعٌ

اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت (بنیاد) کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگھبان ہے، جس عمارت کی بنیاد نہ ہو، وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگھبان نہ ہو، وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

(کنز العمال)



monthlyhosla@gmail.com
azaansahar@gmail.com

اپنی مفید آراء، مثبت تجاویز اور پُرمغز تحریریں اس برقی پتہ پر ارسال کریں۔

www www.azaan.pk/blog


facebook.com/ehtadal


twitter.com/molanaismatulah

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا۔" (سورہ آل عمران، ۱۰۳)

اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے بارے میں نہایت بلیغ اور حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے کہ سب سے پہلے وہ اصول اور گر بتلایا جو انسانوں کو باہمی مربوط اور متفق کرنے کا نسخہ اکسیر ہے، اس کے بعد آپس میں متفق ہونے کا حکم دیا، اس کے بعد آپس کے افتراق وانتشار سے منع فرمایا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ اتفاق واتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود ومطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں، کسی مذہب ومشرب سے تعلق رکھتے ہوں سب کا اتفاق ہے اس میں دورائے ہونے کا امکان ہی نہیں، دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کو بذاتہ مفید اور بہتر جانتا ہو، اس لئے دنیا کی ہر جماعت، ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہیں، لیکن دنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں، گروہوں، پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے، پھر ہر فرقہ کے اندر فرقے اور پارٹی کے اندر پارٹیوں کا لامحدود سلسلہ ایسا ہے کہ صحیح معنی میں دو آدمیوں کا اتحاد واتفاق بھی ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے، وقتی اغراض کے تحت چند آدمی کسی بات پر اتفاق کرتے ہیں، اغراض پوری ہوجائیں، یا ان میں ناکامی ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ اتفاق ختم ہوجائے بلکہ افتراق اور عداوتوں کی نوبت آتی ہے غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوگا کہ ہر گروہ و ہر فرقہ اور ہر شخص لوگوں کو اپنے خود ساختہ پروگرام پر متحد ومتفق کرنا چاہتا ہے، اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو وہ ان سے متفق ہونے کی بجائے ان کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اس لئے لازمی طور پر ہر دعوتِ اتحاد کا نتیجہ ایک ہی جماعتوں اور افراد کا افتراق و انتشار نکلتا ہے، اور اختلافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی انسانیت کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔۔

اس لئے قرآن حکیم نے صرف اتحاد واتفاق اور تنظیم واجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ وعادلانہ اصول بھی بتلا دیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے، وہ یہ ہے کہ کسی انسانی دماغ یا چند انسانوں کے بنائے ہوئے نظام و پروگرام کو دوسرے انسانوں پر تھوپ کر ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ سب اس پر متفق ہوجائیں گے عقل وانصاف کے خلاف اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، البتہ رب العالمین کا دیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق ہونا ہی چاہیے، کوئی عقلمند انسان اس سے اصولاً انکار نہیں کرسکتا، اب اگر اختلاف کی کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہوسکتی ہے کہ احکم الحاکمین رب العالمین کا بھیجا ہوا نظام کیا اور کون سا ہے؟ یہودی نظامِ تورات کو، نصاریٰ نظامِ انجیل کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا واجب التعمیل بتلاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ لیکن اول تو اگر انسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرا بلند ہوکر اپنی عقل خداداد سے کام لے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوکر اس کے سامنے آجاتی ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیام قرآن کی صورت میں لائے ہیں، آج اس کے سوا کوئی نظام اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اس وقت مخاطب مسلمان ہیں جن کا اس پر ایمان ہے کہ آج قرآن کریم ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جو بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے، اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے، اس لئے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف وتغییر کا بھی امکان نہیں، اس لئے سردست میں غیر مسلم جماعتوں کی بحث کو چھوڑ کر قرآن پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں ہی سے کہتا ہوں کہ ان کے لئے تو صرف یہی لائحہ عمل ہے۔ اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہوجائیں تو ہزاروں گروہی اور نسلی وطنی اختلافات ایک لحظہ میں ختم ہوسکتے ہیں، جو انسان کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ اب اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن اور تعبیر قرآن میں رہ سکتا ہے اور اگر ایسا اختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے مضر بلکہ ایسا اختلاف رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری امر ہے، سو اس پر قابو پانا اور حدود کے اندر رکھنا کچھ دشوار نہیں، بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے آزاد ہوکر ہماری پارٹیاں لڑتی رہیں تو اس وقت خلاف وجدال کا کوئی علاج نہیں رہتا، اور اسی اختلاف وانتشار کو قرآن کریم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کردینے کی وجہ سے ہماری پوری ملت انتشار وافتراق میں پھنس کر برباد ہورہی ہے، قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخہ اکسیر اس طرح بتلایا ہے:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ "یعنی اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھامو"

"(نوٹ:) پوری مسلم قوم کا اتفاق صرف اسلام ہی کی بنیاد پر ہوسکتا ہے نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام نہیں ہوسکتا: یہاں سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے کہ وحدت واتفاق کے لئے ضروری ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کے پابند ہوجائیں، دوسرے یہ کہ سب ملکر مضبوطی کے ساتھ اس نظام کو تھام لیں، تاکہ ملت اسلامی کا شیرازہ خود بخود منظم ہوجائے، جیسا کہ اسلام کے قرون اولیٰ میں اس کا مشاہدہ ہوچکا ہے۔" ماخوذ از تفسیر معارف القرآن، مفتی اعظم مفتی مولانا محمد شفیع صاحب"

امن کی خواہش درست!
مگر
راہِ امن کے انتخاب سے انکار کیوں؟

آسمانی اصولوں اورنظام پر کاربند رہ کر وہ تمام کے تمام مواقع جنم لینے لگتے ہیں جس سے ریاست کا نظامِ عدل بے عیب بن جاتا ہے۔ اور ایک عام شہری کی بنیادی ضرورت ''انصاف'' گھر کی دہلیز پر بغیر کسی توقف کے حاصل ہوتا ہے اور یہی عمل امن کی کنجی ہے۔

پاکستان کی ستر سالہ زندگی پر نظر دوڑانے اور اس کی تاریخ کا ورق ورق دیکھنے سے واضح نظر آئے گا کہ ملک کو مسلسل حوادثات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔تمام کے تمام سات عشروں کے اپنے اپنے وقت کے مطابق اپنے اپنے مسائل تھے جو اس اعتبار کے سنگین تر ہی تھے۔ مسائل کی الجھتی ہوئی ڈوریں کبھی بھی حل ہوتی نظر نہیں آئیں بلکہ ہر آنے والا دور انہیں مزید الجھاتا ہی چلا گیا، حتیٰ کہ مشرقی پاکستان جیسا سانحہ بھی رونما ہوا جس کے کئی سارے پہلو پاکستانی قوم کے لیے ہمیشہ ندامت کا باعث رہے ہیں۔ 2001ء پاکستان کی امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی کے طور پر خود کو پیش کرنا ایک غیر شرعی اور غیر ذمہ دارانہ عمل تھا جس کا نتیجہ یقیناً ملک وملت کے لیے کسی بھی طور پر درست نہ رہا۔ اب کامل ڈیڑھ عشرے سے ملکِ خداداد قتل وغارت گری ، بدامنی و بے چینی اور اضطراب کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ پاکستان کا ایک ایک شہری امن وسکون اور اطمینان کے لمحات دیکھنے کا خواہش مند ہے مگر یہ خواہش خواہش ہی رہتی ہے اور دلوں میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ ۶۰ ہزار سے زائد شہری اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں مگر امن سرکاری وزرا کی زبانوں پر یا اخبارات کی سرخیوں پر ہی صاف نظر آتا ہے، حقیقتاً پوری قوم بے یقینی کی دلدل میں دھنسی نظر آتی ہے۔ دور دور تک ایسے حالات بنتے نظر نہیں آرہے کہ ملکِ پاکستان مثالی امن کی فضائیں دیکھ پائے گا۔سوال یہ ہے کہ پھر ان تمام مسائل کا حل کہاں ہے اور ان مسائل کو سنجیدہ طریقے سے کون حل کرسکتا ہے؟ کیا موجودہ قیادت پر ہی مکمل بھروسہ کیا جا سکتا ہے، کہ وہ ان تمام مسائل کے حل کے لیے سنجیدگی دکھا پائیں گے؟ زیرِ نظر سطور میں ہم ان دو سوالوں کا مختصر جائزہ لیں گے جس سے ''امن کی متلاشی'' دعویداروں کی حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی۔ پاکستان بننے کے بعد جس طبقے نے پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی اور آج تک جس طبقے کے ہاتھ میں ملکی باگ ڈور ہے، ان خاندانوں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ 1947ء سے لیکر اب تک یہی لوگ صاحبِ اقتدار رہے ہیں، جو صرف ملکِ پاکستان کو اپنا ملک ہی نہیں سمجھتے بلکہ یہ ان کے لیے ایک کمائی کا کارخانہ اور دولت نکالنے والی دکان ہے، جہاں سے وہ لوٹ مار کرکے غیر ممالک میں اپنے بینکوں کا پیٹ بھرتے ہیں اور اپنی دولت کا حجم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ انکی

اولادوں کی تعلیم وتربیت بھی وہیں ہوتی ہے، علاج معالجہ بھی غیر ممالک میں کیا جاتا ہے، یہ پردیسی پنچھی پاکستان میں صرف اپنے حاکمانہ اور جاگیردارانہ مفاد کے لیے ہی تشریف لاتے ہیں۔ ایسے میں ان لوگوں سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ یہ پاکستان کی تقدیر سنواردیں گے اور ان حقیقی اقدامات کی طرف مائل ہوں گے جو پائیدار بنیادوں پر ملکِ پاکستان کو امن وسکون سے آراستہ کردیں گے۔ اسلام کے اقتدارِ اعلیٰ کے لیے حاصل کردہ ملکِ پاکستان کی ہمیشہ قیادت اپنے اپنے دور کے ''بلاولوں'' کے پاس رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے جو اس ملک میں بولی جانے والی زبان نہ سمجھ سکتے ہوں اور نہ بول سکتے ہوں وہ قوم کے مسائل سمجھنے کی اہلیت سے کیونکر مالا مال ہوں گے؟ پھر ایسے لوگوں سے امید کہ وہ قوم کو کسی عظیم مقام تک لے جانے میں کامیاب ہوں گے، دھوکہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ جن لوگوں میں کرپشن، لوٹ کھسوٹ روح تک اتر چکی ہو۔ وہ کیونکر بے لوث ہوکر ملک وملت کی فلاح وبہبود کے راستے تلاش کریں گے۔ جب تک ایسی قیادت سامنے نہ آئی جو فی الواقع مخلص، دیانتدار، محنت کش اور فکری ونظریاتی بنیادوں پر ملک کے اساسی تصور سے ہم آہنگ ہو، بھول جائیے کہ ملک امن وسکون اور ترقی کی راہ پر چل نکلے گا۔ اس سوال کے مختصر احاطے کے بعد ہم اس سوال کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ وہ کیا راہِ عمل ہوسکتی ہے جس پر چل کر سرزمینِ پاکستان امن وسکون کا استعارہ بن جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے حصول کے لیے پانچ لاکھ سے زائد شہداء نے جانیں نچھاور کیں اور لاکھوں لوگوں کو ہجرت کی راہوں پر بے سروسامانی اور دکھ اور تکلیف کے بوجھ تلے دب کر نکلنا پڑا۔ انکا مقصد صرف ایک آزاد خطے کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس خطے کو آزاد اور نظامِ اسلام کے لگے بندھے اصولوں سے مزین دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ یہ آزاد سلطنت صرف ایک مسلمان ریاست کے طور پر ہی نہیں پہچانی جائے گی کہ جن کے باشندگان کی اکثریت توحید پرستوں کی ہوگی بلکہ اسکا تعارف ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر ہوگا، جہاں دینِ اسلام کی حاکمیت ہوگی۔ وہاں بغیر کسی ''مستعار لیے ہوئے نظام'' (جمہوریت) کے نظامِ اسلام ہی حرفِ آخر ہوگا۔ مگر بدقسمتی سے ایسا بوجہ نہ ہوسکا۔ دین بیزار طبقات کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور آگئی جو کئی نسلوں سے انگریزی استعمار کی خدمت گزاری کے عوض دولتمند اور جاگیردار بن چکے تھے۔ اب بھی درپردہ ان کے مفادات انگریزی استعمار کی خواہشات کی تکمیل اور بجا آوری میں ہے۔ اسی عمل کے بدولت ملک پاکستان کے روشن مستقبل پر تنزلی اور بدامنی کے مہیب سائے منڈلاتے رہے، کیونکہ یہ ۱۰۰ خاندان انگریز کی قربت کو بھی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ اور اسی قربت اور معراج میں دین پسندی اور اسلامی احکامات اور شعائر کی پاسداری کو بڑی رکاوٹ گردانتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے اس راستہ کو اختیار کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ جس راستہ پر سرزمین پاکستان کے امن وسکون، ترقی وخوشحالی کے یقینی مواقع موجود ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم بذاتِ خود بنفس نفیس دینی امور پر کاربند ہوکر ان راہوں کو مسدود کردے جو ایسی قیادت کی تقویت کا باعث بنتے ہیں، یا ایسی دین بیزار اور لوٹ کھسوٹ کی عادی مجرم قیادت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ دینی امور پر عمل پیرا ہونے سے آسمانی فیصلے بھی ہمارے حق میں صادر ہوں گے جن کی بدولت ایک صالح قیادت سامنے آئیگی۔ جن کے زیرِ سایہ نفاذِ دین کے راستے کی سب رکاوٹیں دور ہوجائیں گی۔ یہاں قابل توجہ اور باعث حیرت امر یہ ہے کہ ہر شخص امن کا خواہشمند اور ترقی کا دلدادہ ہے۔ آپ ریاست مدینہ سے زیادہ ترقی اور امن کہاں دکھا سکتے ہیں جہاں زکوۃ دینے والے تو تھے لینے والے نہ تھے گویا ہر شخص صاحب ثروت اور صاحب حیثیت ہوگیا تھا۔ امن کی حالت یہ تھی کہ خلیفۃ المسلمین رات کے اندھیرے میں ایک عام شہری کی طرح گھوم پھر رہا ہوتا تھا اور عمومی حالات کی نگرانی کررہا ہوتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ جہاں حکمران خوف محسوس کریں اور اپنی حفاظت پر حکومتی مشینری کا بڑا حصہ متحرک رکھیں، وہاں ایک عام شہری کیونکر خوف کے حصار سے نکل سکتا ہے۔ آسمانی اصولوں اور نظام پر کاربند رہ کروہ تمام کے تمام مواقع جنم لینے لگتے ہیں جس سے ریاست کا نظامِ عدل بے عیب بن جاتا ہے۔ اور ایک عام شہری کی بنیادی ضرورت ''انصاف'' گھر کی دہلیز پر بغیر کسی توقف کے حاصل ہوتا ہے اور یہی عمل امن کی کنجی ہے۔ سائل کے تمام اخراجات ریاستِ اسلامی اپنے سر پر لیتی ہے، فوری انصاف ریاستِ اسلامی کی ذمہ داری ہے، جس سے امن وسکون یقینی ہوجاتا ہے۔ ریاست کا ہر شہری تو درکنار ریاست کی فضاؤں میں سانس لینے والے کتے کا بھی ریاست لحاظ وخیال رکھتی ہے۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا تھا کہ

بقیہ صفحہ (50) پر

مغرب کا فکری اتار چڑھاؤ اور راہِ اعتدال!

ایک طائرانہ جائزہ

حافظ کاشف مجاہد

اور وہ ایک مکمل ضابطہ حیات کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے تو پھر اس الٰہی قانون کے سامنے کسی انسان کے ذاتی فلسفہ کی کیا حیثیت؟

میرا ایمان ہے کہ انسانیت اس وقت تک درست سمت میں سفر نہیں کر سکتی جب تک انسان اور کائنات کے بنانے والے کی طرف رجوع نہیں کر لیا جاتا۔

میرا یقین ہے کہ جیسے کلیسہ انسان کو فرشتہ بنانے میں ناکام رہا اسی طرح موجودہ جاہلی تہذیب انسان کو جانور بنانے میں ناکام و نامراد ہو گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:،

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَي النَّاسِ" (سورہ بقرہ، ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا جو اعتدال والی ہے۔ تا کہ تم ہو جاؤ لوگوں پر گواہ۔

جب انسان زندگی کی راہوں میں ایسے ہی بھٹک رہا تھا جیسے کوئی اندھیری رات کا مسافر اپنی راہ کھو بیٹھے، اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو، وہ جس سمت بھی قدم اٹھائے بے یقینی کی کیفیت اس پر طاری ہو۔ اور اسی بے یقینی کی کیفیت میں وہ اپنی منزل کی جستجو میں محوِ سفر ہو، وہ مشرق کی طرف جائے یا مغرب کی طرف، شمال ہو یا جنوب، ہر سمت اٹھے ہوئے قدم اسے منزل سے کہیں دور لے جا رہے ہوں۔ اسکی بے چینی کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو کبھی راہ سے بے راہ ہو گیا ہو، اگر آپ اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ نہ کر پا رہے ہوں تو کبھی کسی صحرا، جنگل یا سمندر کے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو تلاش کیجیے گا۔ اس سے راہ سے بھٹکنے کی وجہ پوچھیے اور اس کی آپ بیتی بھی سن لیجیے۔ اور ہاں! جاتے جاتے اس سے یہ بھی پوچھ لیجیے گا کہ اتنے دلخراش سفر کے بعد آپ بحفاظت اپنے مقام پر کیسے پہنچے؟ اور اگر اس سے کچھ سبق سیکھ پاؤ تو خود بھی سفر کے لیے راہِ اعتدال اپنایئے گا۔ اور دوسروں کو بھی راہِ اعتدال کا سبق سکھایئے گا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان زندگی کی راہ میں بھٹک رہا تھا، خوفناک انجام اس کے سامنے تھا کہ ایسے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی حالت پر رحم فرما کر ایک ایسے راہبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا جو اس کے منزل کو بخوبی جانتا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان راہبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو انسانوں کی اصل منزل دکھا کر رہبری اور رہنمائی کے تمام علوم سے بہرہ ور فرما کر روئے زمین پر انسانوں کو مختلف سمتوں میں بھٹکنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچانے کے لیے رہبر ورحمۃ للّعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنا کر بھیجا۔ کیونکہ سابقہ امتیں آسمانوں سے اتری ہوئی ہدایت کو بارہا پسِ پشت ڈال چکی تھی۔ اور ان ہدایات کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی میں گمنام راہوں میں بھٹک رہی تھیں، انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر نسل در نسل دشمنی اور اس دشمنی کے نتیجے میں انسانیت کا بے دریغ قتل ان کا روز کا معمول بن چکا تھا، کیونکہ ان کے لیے انسان کوئی اہم نہیں تھا۔ بلکہ ان کی خواہشات اہم تھیں جن کی بھینٹ وہ آئے روز کئی

کئی انسانوں کو چڑھا دیتے تھے ۔عورت کو زندہ درگور کر دینا بھی ان کے لیے کوئی مغضوب عمل نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے لیے قابلِ فخر تھا اور یہ سب باتیں ان کے نظریات کی عکاس ہیں جو وہ انسان کے بارے میں رکھتے تھے۔ یہاں اسلام سے پہلے دور کے حالات بیان کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ جب اسلام جیسا عالمگیر مذہب آ گیا جس میں انسان کی تمام ضروریاتِ زندگی کو مدِّ نظر رکھا گیا اور وہ ایک مکمل ضابطہ حیات کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے تو پھر اس الٰہی قانون کے سامنے کسی انسان کے ذاتی فلسفہ کی کیا حیثیت؟ میرے خیال میں ایسے ناپاک فلسفے اگر فرعون ، ہامان ، قارون ، شداد اور نمرود کو بھی پڑھ کر سنائے جائیں تو وہ بھی پکار اٹھیں ۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم!۔۔۔ تو دوستو!

آؤ پھر سے تجدید ایمان کریں۔

ہمیں آج جس مغربی جاہلی تہذیب کا سامنا ہے اور جس پر ہم مٹے جا رہے ہیں اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک خوبصورت ٹشو میں غلاظت لپیٹ کر پلیٹ میں رکھ کر کسی کو پیش کر دیا جائے، اب ٹشو کو کھولنے والا ہی اس کی گندگی اور بدبو کو محسوس کر سکتا ہے۔ تو خود سوچ لیجیے کہ وہ ہمیں کیا راہ دکھلائیں گے جو خود گمنام راہوں پر نکل چکے ہیں۔ ہمیں تو اہلِ مغرب کے یہ فلسفی جو ہمارے لیے ضابطے بنا رہے ہیں خود انسان کے متعلق معلومات کے بارے میں بڑی گھمبیر صورتحال پر کھڑے نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ انسان کے بارے میں بنیادی معلومات سے آگے کچھ بھی نہیں جانتے، چہ جائیکہ وہ انسانوں کے لیے کوئی ضابطہ حیات بنائیں۔ ہمیں تو اہل مغرب انسان اور انسان کی ضروریاتِ زندگی کے متعلق امور پر راہِ اعتدال چھوڑ کر کبھی ایک انتہا پر کھڑے نظر آتے ہیں اور کبھی دوسری انتہا پر۔ انہوں نے تو کبھی اپنی تاریخ میں خود معتدل راہ نہیں اپنائی ، وہ ہمیں کیا راہ دکھائیں گے۔ جو خود ہمیشہ سے معاشی ، معاشرتی ، اخلاقی اور قانونی بے اعتدالیوں کا شکار رہے ہیں ۔مغرب کا انسان کے بارے نظریہ ہمیشہ بے اعتدالیوں کا شکار رہا۔ مغرب کا معاشی نظام بھی ہمیشہ بے اعتدالیوں کا شکار رہا۔ مغرب کا معاشرہ بھی ہمیشہ سے بے اعتدالیوں کا شکار رہا۔ اس بے اعتدالی کے ذمہ دار مغرب کے وہ فلسفی ہیں جو ہر دور میں انسان اور انسان کی زندگی کے متعلق مختلف من گھڑت فلسفے مرتب کرتے رہے

> سینٹ ابراہام نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں اپنے چہرے یا پاؤں پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ یہ ہے وہ دوسری انتہا یورپ کی، جو انسان کو فرشتہ بنانے کی ناکام کوشش تھی۔

اور انسانیت کو گمنام راہوں میں گھسیٹتے رہے، کیونکہ وہ اس کھلی حقیقت اور مشاہدہ کو جھٹلا چکے ہوتے ہیں کہ ہر خالق نے اپنی تخلیق کی ہوئی چیز کے ساتھ اس کو چلانے کے اصول وضوابط ایک کتابچہ کی شکل میں مرتب کر کے دیئے ہوتے ہیں تا کہ ان اصول وضوابط کے مطابق اس چیز کا استعمال کیا جائے، جو اس کے خالق (بنانے والے) نے اس کے ساتھ مرتب کر کے بھیجے ہوتے ہیں ۔ دکھ اس بات کا نہیں کہ اہل مغرب ڈوب رہے ہیں، وہ تو خیر ہے ہی ڈوبنے کا مقام۔ دکھ اس بات کا ہے کہ جن کے پاس ایک خوبصورت راہِ اعتدال تھی، جو زمین پر اللہ کے نائب اور خلافت کے حقدار تھے، وہ خود نبی پاک ﷺ کی پیروی چھوڑ کر، کسی لینن، اسٹالن، مارکس، نطشے، فرائڈ، جون ایلیا، ڈارون وغیرہ کے فرسودہ نظریات کی نذر ہو چکے۔ اور ان کے نظریات کا پرچار کر رہے ہیں اور کبھی مشرق کبھی مغرب کے دھکے کھا رہے ہیں ۔ خود بھی ڈوب رہے ہیں اور ساتھ امت مسلمہ کے اندر بے راہ روی پیدا کر رہے ہیں ۔ میرا یمان ہے کہ انسانیت اس وقت تک درست سمت میں سفر نہیں کر سکتی جب تک انسان اور کائنات کے بنانے والے کی طرف رجوع نہیں کر لیا جاتا۔ انفرادیت میں بھی اور اجتماعیت میں بھی عبادات میں بھی اور معاملات میں بھی۔ یاد رہے کہ مغربی تہذیبِ قدیم بھی بے اعتدالیوں کا شکار رہی اور مغربی جاہلی تہذیبِ جدید بھی انسانوں کے خود ساختہ فلسفوں کی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ میرا یقین ہے جیسے کلیسہ انسان کو فرشتہ بنانے کی بیکار کوششوں میں ناکام رہا اسی طرح موجودہ جاہلی تہذیب بھی انسان کو جانور بنانے کی فرسودہ کوششوں میں ناکام ونامراد ہو گی، (ان شاء اللہ)۔ آیئے یہاں ان چند بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے مغرب ہمیشہ بے راہ روی اور افراط وتفریط کا شکار رہا ہے۔ سید قطب شہیدؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب ''اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل''، میں لکھتے ہیں کہ : ، مغرب میں انسان کا تصور کبھی ایک مقام پر نہیں رہا اور نہ کبھی اس تصور میں اعتدال پیدا ہوا، جس کے نتیجہ میں زندگی کے نظام اور حالات ، انفرادی عمل اور معاشرے کی عام روش ہمیشہ ہی گمراہی اور اضطراب سے دوچار رہے۔ کیونکہ تصورِ انسان اور زندگی کے عملِ واقعی

کو جدا جدا نہیں کیا جاسکتا۔ فکر کی یہ بے راہ روی انسانی عمل سے متعلق نکتہ نظر میں بھی موجود تھی، کہ فطری میلانات، صلاحیتوں اور استعداد کے بارے میں انسان کا رویہ کیا ہو اور معاشرے کے وہ پسندیدہ اخلاق جو معاشرے کے افراد کے اعمال ایک خاص سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ان اخلاق کے ساتھ انسان کیا برتاؤ کرے غرض مغرب ہمیشہ ہی افراط وتفریط میں مبتلا رہا۔کبھی خواہشات کو کچلا گیا تو کبھی بے راہ روی اختیار کی گئی۔کبھی فطری میلانات اور طبعی قوتوں کو پامال کیا گیا اور کبھی انہیں بے لگام چھوڑ دیا گیا۔مغرب نے اپنی طویل تاریخ میں نہ کبھی راہ اعتدال اپنائی اور نہ کسی وقت اس کے تصورات اور اس کے زندگی میں توازن پیدا ہوا۔

آیئے مغرب میں انسان کے بارے میں ایک تصور ملاحظہ کیجیے۔

انسان حیوان!

عالمِ احیاء میں انسان کے امتیازی خصائص پر نظر کرتے ہوئے اور حقائق واقعیہ کے دباؤ سے مجبور ہوکر جدید ڈارونیٹ میں جولیان ہکسلے (انگریز سائنسدان، جس نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک آکسفورڈ میں حیوانیات کی تعلیم دی) کو ڈارون کی قدیم ڈارونیٹ سے کافی کچھ رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ اعتراف کرتے ہوئے کہ انسان ایک مخصوص حیوان ہے۔اپنی کتاب انسان دورِ جدید میں لکھتا ہے:: کہ دیگر حیوانات میں اپنے مقام کے بارے میں انسان کی رائے گھڑی کے پینڈولم کی طرح متحرک رہی ہے۔کبھی اسنے اپنے آپ کو عظیم جانا، کبھی کمتر خیال کیا۔کبھی اسمیں اور دیگر حیوانات میں بہت بڑا فصل پیدا ہوگیا اور کبھی سکڑ کر بالکل مختصر رہ گیا۔ (پنڈولم کے الٹی حرکت کے نتیجے میں) انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے، اس لیے حیات انسانی کے بارے میں انسانی آراء، Tape warm (پیٹ کا کیڑا)، Bacteria یا شلس کی آراء سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔کسی شے کی بقاہی، ارتقائی کامیابی کا پیمانہ ہے۔اگرچہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اس وقت انسان تمام مخلوقات کا سردار ہے مگر اس مقام پر ارتقاء کر کے بلی اور چوہے بھی پہنچ سکتے ہیں، (معاذ اللہ)۔ یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ جہاں اس حیوانی نظریئے نے انسان مرد پر برے اثرات مرتب کیے وہاں انسان عورت کو مرد سے کئی گنا زیادہ متاثر کیا۔کیوں کہ یہ بات مسلّم حقیقت ہے کہ مرد عورت کی نسبت ہر لحاظ سے قوی ہے اس لیے عورت پر جب اس حیوانی نظریئے نے جانوروں جیسا بوجھ ڈالا تو اس کے نتیجے میں عورت اپنے اصل فرائض منصبی سے جو اسے فطرت نے ودیعت کیے تھے، منحرف ہوگئی۔اور اس کے نتیجے میں مغرب کو بڑے بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مثلاً: مغرب کا خاندانی نظام بگاڑ کا شکار ہوگیا، اسقاط حمل کے عمل میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے، (معاذ اللہ)۔

آیئے یہاں انسان کے بارے میں مغرب کا دوسرا تصور ملاحظہ فرمایئے:

انسان فرشتہ!

لیکی ایک مغربی مصنف ہے اپنی کتاب تاریخ اخلاق میں بیان کرتا ہے: دو چار سال نہیں بلکہ پورے دوسو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی۔مؤرخین نے اس کی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں۔سینٹ میکر ویس ؒ ایک راہب، کی بابت مشہور ہے۔کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سوتے رہے، تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں، نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ان کے مرید سینٹ یوسیلبس ؒ تقریباً دو من لوہا اپنے اوپر لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنویں کے اندر مقیم رہے۔ایک مشہور راہب یوضاؒ کے متعلق منقول ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے اس مدت میں ایک لمحہ کے لیے بیٹھے نہ لیٹے، جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے۔بعض زاہد لباس کسی قسم کا استعمال نہیں کرتے تھے، ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں کے بل چلتے تھے۔راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے، بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے۔اہلِ زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا، جسم کی طہارت روح کی پاکی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مراقبۂ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے، اس قدر وہ مجسمہ عفونت وغلاظت ہوتے، سینٹ ایتھینس ؒ نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ اینٹونی بایں کبر سنی کبھی مدت العمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا۔سینٹ ابراہام نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں اپنے چہرے یا پاؤں پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔یہ ہے وہ دوسری انتہا یورپ کی، جو انسان کو فرشتہ بنانے کی ناکام کوشش تھی۔کیونکہ

بقیہ صفحہ (50) پر

سیرتِ باکردار۔کامل الحیاءوالایمان،

شہید مظلومِ مدینہ، جامع القرآن، دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، پیکرِ جودوسخا،

ذوالنورین، خلیفہ سوم، امیرالمؤمنین

سیدنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

واصدقھم حیاءً عثمان

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ایک چمکتا دمکتا ستارہ، ایک مہر منیر، ایک آفتابِ عالم تاب حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مقدس ہستی بھی ہیں۔آپؓ تیسرے خلیفہ راشد ہیں،۔اہل بدر میں سے ہیں۔ان دس صحابہؓ میں سے ہیں جنہیں دنیا میں جنت کی بشارت ملی۔اللہ کی راہ میں دومرتبہ ہجرت کرنے والوں میں سے ہیں۔سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔18 ذی الحجہ یوم شہادتِ سیدنا عثمان غنیؓ کی مناسبت سے آپؓ کے کچھ حالات نذر قارئین ہیں۔

شہید راہ حق وخلیفہ مظلوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

خلیفہ راشد سوئم، کاملِ حیاوایمان حضرت عثمان بن عفانؓ کا نام عثمان، کنیت ابوعبداللہ اورابوعمراورلقب ذوالنورین تھا۔والد کا نام عفان بن ابی العاص اور والدہ کا نام اروی بنت کریز تھا، اروی کی والدہ ام

محمد ابو الحسن

حکیم البیضا تھیں جو جناب عبدالمطلب کی صاحبزادی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھیں۔آپکا تعلق شہر مکہ کے قبیلہ قریش کی شاخ بنوامیہ سے تھا۔آپکی پیدائش علامہ سیوطیؒ کے مطابق عام الفیل کے چھٹے سال ہوئی۔ حضرت عثمانؓ کا شمار سابقون الاولون میں ہوتا ہے۔آپؓ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں، آپ کا شمار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب شوریٰ میں بھی ہوتا ہے۔امت مسلمہ میں کامل الحیاءوالایمان کے الفاظ آپؓ کی ہی شان میں استعمال کیے جاتے ہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ میں اس سے کس طرح حیاء نہ کروں، جس سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں۔آپؓ نے اسلام کی راہ میں بڑے شدائد برداشت کیے، مگر دامے، درمے اور سخنے اسلام کے لیے سرگرم رہے۔

قبول اسلام تا خلافت حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عثمانؓ نے ابتدائی زمانۂ اسلام میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔قبول اسلام کے کچھ ہی عرصہ بعد آپؓ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت بی بی رقیہؓ سے ہوگیا۔یہ نکاح اتنا بابرکت تھا کہ مکے میں عام طور پرلوگ کہا کرتے تھے، بہترین جوڑا جوکسی انسان نے دیکھا، رقیہؓ اوران کے خاوند عثمانؓ ہیں(ابن کثیر) ۔ بعدازاں ۵ نبوی میں آپؓ کو ہجرتِ حبشہ کا شرف بھی حاصل ہوااور راہِ اسلام میں آپ اپنا آبائی وطن ترک کرکے حبشہ چلے گئے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی، حضرت لوط علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اللہ کی طرف ہجرت کی ہے۔جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی تو آپؓ بھی مدینہ چلے آئے، جہاں آپؓ نے اسلام اورمسلمانوں کے لیے گرانقدر کارنامے انجام دیئے۔غزوہ بدر کے دوران ہی

جب حضرت رقیہؓ کا وصال ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کا نکاح بھی حضرت عثمانؓ سے کر دیا جس کہ بعد آپ کا لقب ذوالنورین یعنی دونوروں والا ہو گیا۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے ایک روایت کے مطابق آپؓ کو ملاء اعلیٰ میں بھی ذوالنورین کہہ کر پکارا گیا۔ 9ھ میں جب حضرت ام کلثومؓ کا بھی وصال ہو گیا، اس موقع ابن اثیرؒ نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں انہیں یکے بعد دیگرے عثمانؓ سے بیاہ دیتا۔

اللہ کی راہ میں سخاوت!

حضرت عثمانؓ کے والد ایک کامیاب تاجر تھے، ان کے انتقال کے بعد آپؓ نے اپنی فراست سے تجارت کو مزید ترقی دی اور اس کا دائرہ کئی ممالک تک پھیلا دیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو خوب مال دیا تھا اسی طرح اسے اپنے راہ میں لگانے کا جذبہ بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؓ کو زبانِ نبوت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے "غنی" کا خطاب ملا۔ آپؓ کی فیاضی وسخاوت تاریخ اسلام کا درخشاں باب ہے، بطور نمونہ چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

بئر رومہ کی تعمیر:

کیا آپ کو معلوم ہے کہ سعودی عرب کے ایک بینک میں حضرت عثمانؓ کا آج بھی کرنٹ اکاؤنٹ ہے۔ یہ جان کر بھی آپ کو حیرت ہوگی کہ مدینہ منورہ کی میونسپلٹی میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے نام پر باقاعدہ جائیداد رجسٹرڈ ہے۔ آج بھی آپؓ کے نام پر بجلی اور پانی کا بل آتا ہے۔ پچھلے دنوں مسجد نبوی کے قریب ایک عالیشان رہائشی ہوٹل بن رہا تھا جس کا نام "عثمان بن عفانؓ ہوٹل" ہے۔ تفصیل جاننا چاہیں گے؟ یہ وہ عظیم صدقہ جاریہ ہے جو حضرت عثمان بن عفانؓ کے صدق نیت کا نتیجہ ہے۔

جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں پینے کے صاف پانی کی بڑی قلت تھی۔ ایک یہودی کا کنواں تھا جو مسلمانوں کو پانی مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔ اس کنویں کا نام "بئر رومہ" یعنی رومہ کا کنواں تھا۔ مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کون ہے جو یہ کنواں خریدے اور مسلمانوں کیلئے وقف کر دے، ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں چشمہ عطا کرے گا۔ حضرت عثمان بن عفانؓ، یہودی کے پاس گئے اور کنواں خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ کنواں چونکہ منافع بخش آمدنی کا ذریعہ تھا اس لئے یہودی نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے یہ تدبیر کی کہ یہودی سے کہا کہ پورا کنواں نہ سہی، آدھا کنواں مجھے فروخت کر دو۔ آدھا کنواں فروخت کرنے پر ایک دن کنویں کا پانی تمہارا اور دوسرے دن میرا ہوگا۔ یہودی لالچ میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ حضرت عثمانؓ اپنے دن میں پانی زیادہ پیسوں میں فروخت کریں گے، اس طرح مزید منافع کمانے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے آدھا کنواں حضرت عثمان کو فروخت کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا دن مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ لوگ حضرت عثمانؓ کے دن مفت پانی حاصل کرتے اور اگلے دن کیلئے بھی ذخیرہ کر لیتے۔ یہودی کے دن کوئی شخص بھی پانی خریدنے نہیں جاتا۔ یہودی نے دیکھا کہ اس کی تجارت ماند پڑ گئی ہے تو اس نے حضرت عثمانؓ سے باقی آدھا کنواں خریدنے کی گزارش کی۔ اس پر حضرت عثمانؓ راضی ہو گئے اور پورا کنواں خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔ اس دوران ایک آدمی نے حضرت عثمانؓ کو کنواں دگنا قیمت پر خریدنے کی پیشکش کی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ مجھے اس سے کہیں زیادہ کی پیشکش ہے۔ اس نے کہا کہ 3 گنا دوں گا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا مجھے اس سے کئی گنا کی پیشکش ہے۔ اس نے کہا کہ میں 4 گنا دوں گا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا مجھے اس سے کہیں زیادہ کی پیشکش ہے۔ اس طرح آدمی بڑھاتا رہا اور حضرت عثمانؓ یہی جواب دیتے رہے۔ اس آدمی نے کہا حضرت آخر کون ہے جو آپ کو 10 گنا دینے کی پیشکش کر رہا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میرا رب مجھے ایک نیکی پر 10 گنا اجر دینے کی پیشکش کرتا ہے۔

وقت گزرتا گیا اور یہ کنواں مسلمانوں کو سیراب کرتا رہا یہاں تک کہ کنویں کے اردگرد کھجوروں کا باغ بن گیا۔ عثمانی سلطنت کے زمانے میں اس باغ کی دیکھ بھال ہوئی۔ بعد ازاں سعودی حکومت کے عہد میں اس باغ میں کھجوروں کے درختوں کی تعداد 1550 ہو گئی۔

یہ باغ میونسپلٹی میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے نام پر رجسٹرڈ ہوا۔ وزارت زراعت یہاں کے کھجور، بازار میں فروخت کرتی اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حضرت عثمان بن عفانؓ کے نام پر بینک میں جمع کرتی رہی یہاں تک کہ اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہو گئی کہ مرکزی علاقہ میں ایک پلاٹ لیا گیا جہاں فندق عثمان بن عفانؓ کے نام پر ایک رہائشی

ہوٹل تعمیر کیا جانے لگا۔اس ہوٹل سے سالانہ 50 ملین ریال آمدنی متوقع ہے۔اس کا آدھا حصہ یتیموں اور غرباء میں تقسیم ہوگا جبکہ دوسرا آدھا حصہ حضرت عثمانؓ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگا۔

اندازہ کیجئے کہ حضرت عثمانؓ کے اس مقدس عمل کو اللہ تعالیٰ نے کیسے قبول فرمایا اور اس میں ایسی برکت عطا کی کہ قیامت تک کیلئے ان کیلئے صدقہ جاریہ بنادیا۔

مسجد نبوی میں اضافہ:

مسجد نبوی کے رقبہ میں پہلا اضافہ نبی پاک ﷺ کی ایما پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا۔اور مسجد سے متصل ایک قطعۂ زمین ۲۵ ہزار درہم میں خرید کر مسجد میں شامل کر دیا۔ بعدازاں اپنے عہد خلافت میں بھی آپؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع پر خاص توجہ فرمائی۔(تاریخ ابن کثیر)

آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کی خدمت میں بھی وقتاً فوقتاً ہدایا بھیجتے تھے۔

دور صدیقیؓ میں پڑنے والے قحط کے موقعے پر ایک ہزار اونٹوں پر آنے والا پورا غلہ ضرورت مندوں میں صدقہ کر دیا، حالانکہ تاجران سے کئی گنا زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے تیار تھے، مگر آپؓ نے سب غلہ راہِ الٰہی میں صدقہ کر دیا۔

عہد نبوی سے لے کر اپنے دورِ خلافت کے اختتام تک آپؓ کا یہ پسندیدہ مشغلہ رہا کہ قدیم مساجد کی تزئین وتوسیع میں رقم لگاتے اور نئی عالی شان مساجد تعمیر فرماتے تھے۔

امہات المومنین رضوان اللہ علیہنّ اجمعین کو علیحدہ علیحدہ مکانات تعمیر کرا کے دیئے۔

جس دن اسلام لائے، اس دن سے لے کر شہادت والے دن تک بلا ناغہ ہر جمعے کو ایک غلام خرید کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آزاد کرنے کا معمول رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آپؓ نے کل 2 ہزار 4 سو غلام آزاد فرمائے۔ اسی طرح ہر جمعہ ایک اونٹ ذبح کرا کر اس کا گوشت غریبوں میں بانٹنے کا بھی معمول تھا۔

شہداء کے گھرانوں کی کفالت آپؓ اپنا فرض منصبی سمجھ کر اپنے مال سے کیا کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کا ایک لقب غنی بھی تھا اور درحقیقت آپؓ اس لقب کے پوری طرح مستحق تھے۔یوں تو ساری عمر آپؓ نے اپنا مال بڑی فیاضی سے راہ اسلام میں خرچ کیا تاہم تاہم غزوہ تبوک میں آپؓ کا مالی انفاق حد سے بڑھ گیا، آپؓ نے اس موقع پر روایات کے مطابق نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے، دو سو اوقیہ چاندی اور ایک ہزار دینار خدمتِ نبوی میں پیش کیے جس پر خوش ہو کر نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آج کے بعد عثمانؓ جو بھی کریں انہیں ضرر نہ ہوگا۔

اسی غزوے میں نقد ایک ہزار دینار بھی جہادی فنڈ میں جمع کرا دیئے۔اسی موقعے پر حضور اکرم ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار یہ دعا فرمائی۔"اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہوں، اے اللہ! تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ پھر صحابہؓ سے بھی فرمایا تم سب بھی عثمانؓ کے حق میں دعا کرو۔

(ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء)۔

سفارت ونمائندگی رسول اکرم ﷺ:

آپؓ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے 1400 صحابہؓ سے اپنی رضا مندی کا اعلان فرمایا۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ واقعہ حدیبیہ 6 کے نازک موقع پر یہ حضرت عثمانؓ ہی تھے جنہوں نے سفارت کے فرائض انجام دیئے اور نبی اکرم ﷺ کے نمائندے کی حیثیت سے آپ ﷺ کا پیغام قریش تک پہنچایا اور اس سلسلے میں اپنی جان تک کی پرواہ نہ کی۔اور یہی وہ موقع تھا جب آپؓ کے قتل کی افواہ اڑ گئی تو نبی پاک ﷺ نے آپؓ کا قصاص لینے کے لیے بیعت شجرہ فرمائی اور اس میں اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر بیعت لی۔کہ جب تک ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ ہے، حضرت عثمانؓ کا بدلہ ضرور لیں گے۔اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کو پسند فرمایا اور سورۃ الفتح نازل فرمائی، جس میں فرمایا کہ" میں تمام بیعت کرنے والوں سے راضی ہوں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے" (سورۃ الفتح ۱۰ تا ۱۸)

حضرت عثمانؓ عہد شیخینؓ (حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما) میں بھی حسب سابق شیخینؓ کے مشیر ومعتمد رہے، ساتھ ہی ہمہ تن دین اسلام کے لیے وقف رہے اور انکا مال ودولت ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہوتا رہا۔

خلافت عثمانی:

اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عثمانؓ نے سب سے عظیم کارنامہ جمعِ قرآن کا انجام دیا۔درحقیقت کتابی صورت میں کتاب اللہ کی تدوین عہدِ ابوبکرؓ میں ہی ہو چکی تھی، تاہم اسکی اشاعت نہ ہوئی تھی جسکی وجہ سے مختلف علاقوں کے رہنے والوں کی قرأت میں اختلاف پھیل رہا تھا۔حضرت حذیفہؓ کے توجہ دلانے پر حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد کا مدوّن کیا ہوا نسخہ منگوا کر قریش کی قرأت کے مطابق اس کی نقول کروائیں اور پھر یہ نقول

ملک کے مختلف حصوں میں روانہ کردیں گئیں اوراس مستند نسخہ کے علاوہ دیگر مصاحف کو آپؓ نے تلف کروادیا۔حضرت عثمانؓ کا یہ عظیم کارنامہ کارنامہٗ صدیقی کی طرح تکملہٗ کارِنبوت کی حیثیت رکھتا ہے آپؓ کا سب سے بڑا کارنامہ، جو بعد میں آپؓ کی شہادت کا بنیادی محرک بھی ثابت ہوا، تمام مسلمانوں کوقرآن مجید کی ایک قرأت پر جمع کرنا ہے ۔اس کے علاوہ آپؓ نے حضرت عمرؓ کے دور میں شروع ہونے والی فتوحات کی تکمیل کی اور 24 لاکھ مربع میل پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ بیت المال کی تنظیم نو، حجاز میں نہروں کا جال بچھانا، مدینہ کو سیلاب سے بچانے کے لئے ڈیم تعمیر کرنا، نئی سڑکیں اور پل تعمیر کرانا، کنویں کھدوانا، سرکاری عمارات و دفاتر تعمیر کرنا، نئے سکے جاری کرنا اور وقف عام کا قیام آپؓ کے دورِ خلافت کے نمایاں کارنامے ہیں۔آپؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپؓ نے دستوراسلامی کی حفاظت آخر دم تک کر کے مفسدوں کے ارادوں کو ناکام بنایا۔

شہادت کبریٰ!

یہودی النسل عبد اللہ بن سبا نے کوفہ، بصرہ اور مصر کے مفسدین کو مجتمع کیا۔انہوں نے آپؓ پر بے سروپا الزامات عائد کیے۔جن کا آپؓ نے ہر سطح پر جواب دیا۔ ایامِ حج میں، جبکہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین فریضہٗ حج کی ادائیگی کے لیے گئے ہوئے تھے، ان سازشیوں نے موقع غنیمت جانا اور آپؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا، اس 40 روزہ محاصرے میں آپؓ کے اہل خانہ تک کو کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہ پہنچنے دی۔ساتھیوں نے مقابلہ کرنے کی اجازت چاہی تو فرمایا کہ میں نبی ﷺ کے شہر میں خون نہیں بہانا چاہتا۔آپؓ نے تمام مظالم برداشت کیے مگر حضور ﷺ کے فرمان کے بموجب خلعتِ خلافت کو اتارنے سے انکار کردیا۔

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو نبی اکرم ﷺ کے اس محبوب خلیفہ کو ایک عظیم سازش، جو کہ درحقیقت اسلامی تاریخ کی سب سے اول اور سب سے عظیم سازش تھی، کے بعد اس عالم میں قتل کر دیا گیا کہ آپؓ قرآن کی تلاوت کررہے تھے، کئی دن کے روزے سے تھے، اور اپنے گھر میں محصور تھے۔گو کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما سمیت کئی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپؓ کے گھر کے دروازے پر پہرہ بھی دے رہے تھے لیکن اس کے باوجود بلوائی آپ کے گھر میں پیچھے کی سمت سے داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔اور عین تلاوت قرآن کی حالت میں خلیفہ وقت اور امیر المومنین سیدنا عثمان غنیؓ کو شہید کردیا گیا۔یہ عظیم سازش جو عبداللہ بن سبا سمیت متعدد منافقین کی سعی کا نتیجہ تھی درحقیقت صرف حضرت عثمانؓ کے خلاف نہ تھی بلکہ اسلام اور تمام مسلمانوں کے خلاف تھی اور آپؓ کی شہادت کے بعد وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مسلمان تفرقہ اور انتشار میں ایسے گرفتار ہوئے کہ نکل نہ سکے۔یہ وہ بات تھی جس کی خبر حضرت عثمانؓ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ بخدا اگر تم نے مجھے قتل کردیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھو گے نہ ایک ساتھ جہاد کرو گے۔آپؓ کی شہادت پر مدینہ میں ایک عام کہرام مچ گیا۔حضرت سعید بن زیدؓ نے ارشاد فرمایا لوگو! واجب ہے کہ اس بداعمالی پر کوہِ احد پھٹے اور تم پر گرے، حضرت انسؓ نے فرمایا حضرت عثمانؓ جب تک زندہ تھے اللہ کی تلوار نیام میں تھی، اس شہادت کے بعد یہ تلوار نیام سے نکلے گی اور قیامت تک کھلی رہے گی، حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا اگر حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ بھی نہ کیا جاتا، تو لوگوں پر آسمان سے پتھر برستے، حضرت علیؓ کو جیسے ہی شہادتِ عثمانؓ کی خبر ملی آپؓ نے فرمایا: اے اللہ میں تیرے حضور خونِ عثمانؓ سے بریت کا اظہار کرتا ہوں اور ابن کثیرؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ان پر گر پڑے اور رونے لگے حتیٰ کے لوگوں نے خیال کیا کہ آپؓ بھی ان سے جاملیں گے۔

امام اعمشؒ اور حافظ ابن عساکرؒ نے صاحب اسرارِ رسول ﷺ حضرت حذیفہؓ بن یمان سے روایت کیا ہے کہ آپؓ نے ارشاد فرمایا کہ: سب سے پہلا فتنہ حضرت عثمانؓ کا قتل ہے اور سب سے آخری فتنہ خروجِ دجال ہے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ وہ شخص جس کے دل میں ایک دانے کے برابر بھی حضرت عثمانؓ کے قتل کی حبّ (محبت) ہے، اگر اس نے دجال کو پالیا تو وہ اس کی پیروی کیے بغیر نہیں مرے گا اور اگر اس نے اسے نہ پایا تو وہ اپنی قبر میں اس پر ایمان لائے گا۔

علامہ ذہبیؒ نے آپؓ کے کمالات وخدمات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے' ابوعمر عثمانؓ، ذوالنورین تھے۔ان سے فرشتوں کو حیا آتی تھی۔انھوں نے ساری امت کو اختلافات میں پڑ جانے کے بعد ایک قرآن پر جمع کردیا۔وہ بالکل سچے، کھرے، عابدِ شب زندہ دار اور صائم النہار تھے اور اللہ کے راستے میں بے دریغ خرچ کرنے والے تھے، اور ان لوگوں میں سے تھے جن کو آنحضرت ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے۔رضی اللہ عنہ ورضاعنہ۔۔۔

آئیے پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کریں!!!

ایک چونکا دینے والی تحریر

(حصہ دوم)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

آج ہر اسلامی ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے افراد کا حال یہ ہے کہ اعتقاد وایمان کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔۔۔
بعض اس لادینی رجحان کو طاقت کے زور سے قوم پر ٹھونس دینا چاہتے ہیں اور بعض قوم کو اس شیشے میں خوبصورتی کے ساتھ اتارنے کی راہ پر گامزن ہیں،
مگر منزل سب کی ایک اور مقصد وہدف سب کا واحد!

ممالک اسلامیہ میں دور "جاہلیت" کا اعزاز

لیکن بہت سے اسلامی ملکوں اور مسلمان قوموں کا حال اس وقت یہ ہے کہ وہ صرف مغربی فلسفوں اور اہل مغرب کے طرز فکر سے مرعوبیت کے ماتحت اپنے قبل اسلام کے عہد اور اس عہد کی تہذیب ورسوم کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، ان میں اس عہد سے دلی لگاؤ سا پیدا ہوتا جا رہا ہے، ان میں خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس عہد کے شعائر کو زندہ کریں، اور اس کے مشاہیر، بادشاہوں اور ناموروں کو تاریخ کی زندۂ جاوید ہستیوں میں جگہ دلا دیں، گویا یہ ان کا کوئی زریں دور تھا، اور کوئی نعمت تھی، جو اسلام نے ان سے چھین لی......

العیاذ باللہ! یہ کیسی کھلی ناشکری اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی ناقدری ہے.....! اسکا مطلب تو یہ

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ہوا کہ کفرو بت پرستی کی شناعت دلوں سے نکل گئی ہے اور جاہلی خرافات سے کوئی نفرت باقی نہیں رہ گئی ہے..... اور یہ وہ باتیں ہیں کہ ایک باشعور مسلمان کے متعلق ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ان پر تو ایمان اگر سلب ہو جائے، اسلام کی دولت سے محروم کر دیا جائے اور اللہ کی رحمت کی بجائے اس کا عتاب سامنے آجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں.....

قرآن نے آگاہ کیا ہے:۔ "وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ" (ھود، ۱۱۳)

اور مت میلان رکھو ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم (شرک) کیا، ورنہ کہیں تم کو بھی کہیں آگ نہ پکڑ لے اور نہ نکلے اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی مددگار، پھر نہ ہو سکے تمہاری کوئی مدد۔

دینی واخلاقی انتشار

ان قوم پرستانہ رجحانات کے علاوہ ایک اور فتنہ بھی ہے جس سے آج کا عالم اسلام دوچار ہے اور وہ ہے اونچے طبقوں میں آنکھیں بند کر کے مادیات کے پیچھے دوڑنے کا رجحان کہ ہر عقیدہ اور ہر قدر اس پر قربان، دوسرے الفاظ میں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا رجحان، دنیاوی زندگی پر فریفتگی اور نفس پرستی کا رجحان، اور پھر اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا کرتا ہے یعنی بے اخلاقی، بے راہ روی، محرمات الہیہ کا استخفاف، فسق وشراب کا شیوہ وعموم اور اسلامی فرائض وقیود سے اس طرح کلی آزادی جیسے اس طبقہ کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں، یا اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے..... اور وہ کوئی داستانِ

بلکہ بہت سوں کا حال تو یہ ہو چکا ہے کہ اسلامی عقیدے سے کھلے باغی اور مغربی فلسفوں اوران فلسفوں کے لائے ہوئے افکار وعقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان، ان کے لئے دنیا سے لڑ جانے کا جوش وولولہ اور ان کی نشر واشاعت کا جنون، یہ فکر کہ زندگی کا نظام ان فلسفوں کی روشنی اوران کی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔۔۔۔

پارینہ اورقصہ وافسانہ ہے، دنیائے اسلام کے تمام ملکوں کے اونچے طبقے کے افراد میں بہت بڑی تعداد آپ کو اسی رنگ اوراسی مسلک کی ملے گی.... گویا ایک ہی تصویر ہے، جس کی مختلف کاپیاں کردی گئی ہیں۔

عالم اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ

یہ ہے اجمال کے پیرائے میں آج کے عالم اسلام کی دینی اور اعتقادی تصویر! اس تصویر میں جو کچھ نظر آتا ہے میرے نزدیک یہ جاہلیت کی ایک موج ہے جو اسلام کا سارا سرمایہ بہائے لئے جارہی ہے، دنیائے اسلام کو اپنی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ سرکش موج سے سابقہ نہیں پڑا ہے، نہ اس جیسی طاقتور مخالف موج کا سامنا عالم اسلامی کو کبھی ہوا ہے، اور نہ اس جیسی ہمہ گیر موج کا۔اور پھر اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی ہلاکت خیزیوں پر چونکنے والے کم، اوروہ تو کم سے بھی کمتر ہیں جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور اپنی قوتوں کا سرمایہ لے کر اس کے مقابلے پر ڈٹ گئے ہوں، ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں یونانی فلسفے کے اثر سے جونہی الحادو زندقہ پھیلنا شروع ہوا فوراً ایسی ہستیاں سامنے آ کھڑی ہوئیں جنھوں نے اپنے علمی تبحر، عظیم عقلیت، نادرۂ روزگار ذکاوت اور قوی شخصیت کے سارے ہتھیاروں سے اس کے خلاف جنگ کی، ایسے ہی باطنیت اور ملاحدہ کی جماعت کا ظہور ہوا تو اس کے مقابلے میں بھی علم وحکمت اور دلیل وبرہان کی تلواریں لیکر اسلام کے سرفروش میدان میں آکودے، چنانچہ اسلام ان بروقت نصرتوں کی بناء پر علمی وعقلی اعتبار سے ایسی مضبوط پوزیشن میں رہا کہ مخالفت کی موجیں اٹھتیں اور سر ٹکرا کر واپس چلی جاتیں، سیلاب کے ریلے آتے اور بے اثر ہوکر گزر جاتے۔

اولین مسئلہ

عالم اسلام کا وہ مسئلہ جو طوفان بن کر کھڑا ہوا ہے اور جس کا رخ براہ راست دین کی طرف ہے، کفر وایمان کا یہی مسئلہ ہے، سوال یہ ہے کہ اسلامی دنیا اسلام پر قائم رہے گی یا اس کا قلادہ اپنے گردن سے اتار دے گی؟

اسلامی دنیا میں آج ایک معرکہ برپا ہے، جس میں ایک طرف مغرب کا فلسفۂ لادینیت ہے، دوسری طرف اسلام ...... خدا کا آخری پیغام ......! ایک طرف مادیت ہے اور دوسری طرف آسمانی شریعت! میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین اور لادینیت کا آخری معرکہ ہے اور اس کے بعد دنیا دونوں میں سے کسی ایک رخ کو اختیار کرلے گی۔

مقدس ترین جہاد

آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے، جو عالم اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، نہیں! بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب ومرکز پر حملہ کیا جائے، وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے اساسات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وہ اعتماد واپس لایا جائے، جس کا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے، جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے، اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح سے مطمئن کردیا جائے، آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں، ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں!

کامل ایک صدی گزرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے شک والحاد، نفاق وارتیاب کا ایک طوفان ہے، جو اس نے ہمارے دل ودماغ پر برپا کر رکھا ہے، غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہورہا ہے اور سیاست اور اقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہورہے ہیں..... کامل ایک صدی سے اس شکست وریخت کا سلسلہ جاری ہے ..... لیکن ہمیں اس کے مقابلے کی کوئی فکر نہیں ہوئی، ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق قدیم علمی ترکہ پر اضافے کرنا بھی ہمارا فرض ہے....... ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ یورپ کے

ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں، ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نذر ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے، گویا یکا یک یہ منظر آیا کہ ایمان وعقیدہ کی دنیا متزلزل ہے، اور ایک ایسی نسل تیار ہوکر برسر اقتدار آچکی ہے جو نہ اسلام کے عقائد ومبادی پر ایمان رکھتی ہے، نہ اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت سے معمور ہے اور نہ اس کا کوئی علاقہ اپنی مومن ومسلم قوم سے اس کے سوا ہے کہ قومیت کے خانے میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے، یا اگر کچھ تعلق ہے، تو وہ محض سیاسی مصالح کی حد تک! بس اس کے سوا کوئی تعلق نہیں! اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر صورتحال یہ ہے کہ لادینی مزاج اور لادینی اندازِ فکر، ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستے سے جمہور تک پہنچ چکا ہے اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانے کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے...... خاکم بدہن! وقت کی رفتار وہ وقت قریب لا رہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے کہیں بے دخل کر کے نہ رکھ دیا جائے۔

دعوت ایمان

یہ وقت عالم اسلامی میں ایک نئی اسلامی دعوت کا متقاضی ہے، اس دعوت وجدوجہد کا نعرہ اور نشانہ ہو ''آؤ پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کریں''......... لیکن تنہا یہ نعرہ کافی نہیں ہے، اس سے پہلے وہ نفسیاتی راستہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، جس سے عالم اسلام کے موجودہ برسر اقتدار طبقہ کے دل و دماغ تک پہنچایا جاسکے اور اسے اسلام کی طرف لوٹایا جاسکے۔

بے غرض داعیوں کی ضرورت

آج عالم اسلام کو ایسے مردان کار کی ضرورت ہے، جو صرف اسی دعوت کے پیچھے ہو رہیں، اپنا علم، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال ومتاع اس کے لئے وقف کردیں، کسی جاہ ومنصب یا عہدہ وحکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں، کسی کے لئے ان کے دل میں کینہ وعداوت نہ ہو، فائدہ پہنچائیں، مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں، دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں، ان کا طرز عمل سیاسی رہنماؤں کے طرز عمل سے ممتاز

> دوسرا گروہ بالکل اس کی ضد ہے، وہ اس طبقے سے تعاون کرتا ہے، مال وجاہ میں اس کا شریک بنتا ہے، اس کے ذریعہ اپنی دنیا بناتا ہے، اس کا دین سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، پس اس گروہ میں نہ کوئی دعوتی روح ہے، نہ دینی غیرت کا مظاہرہ، نہ یہاں اس بگڑے ہوئے طبقے کی اصلاح کی کوئی حرص وفکر پائی جاتی ہے اور نہ اسے اس قرب وتعاون میں کوئی پیغام ملتا ہے۔۔۔

اور ان کی دعوت وجدوجہد سیاسی تحریکات (جس کا مطمح نظر محض حصول اقتدار ہوتا ہے) سے مختلف اور جداگانہ ہو، اخلاص ان کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز ہو۔!

دعوت کے لئے نئے علمی اداروں کی ضرورت

اس پر اضافہ یہ کہ آج ایسے علمی ادارے ACADEMIES عالم اسلامی کی بڑی اہم ضرورت ہیں، جو ایسا طاقتور اسلامی ادب پیدا کریں جو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دوبارہ کھینچ کر اسلام...... وسیع معنی میں اسلام...... کی طرف لاسکے جو انہیں مغرب کے ان فلسفوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے، جنہیں ان میں سے کچھ نے سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر محض وقت کی ہوا سے متاثر ہوکر حرز جان بنالیا ہے... وہ ادب...... جو ان کے دماغوں میں از سر نو اسلام کی بنیادیں اٹھائے اور قلب وروح کی غذا بنے...... اس کام کے لئے عالم اسلام کے ہر گوشے میں آج ایسے ارباب عزیمت درکار ہیں جو معرکے کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتادینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں، جو دین وسیاست میں تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں، جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالت کے ہر سانچے میں (خوہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فٹ ہوجائے، اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے، جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ..... ''الشجرۃ الملعونۃ فی القرآن''...... کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں، اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں میں ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا، جب تک

دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا۔

ماضی کے تجربے

لیکن بات ترتیب اور تقدیم وتاخیر کی ہے، دینی حکمت اور دینی تفقہ کی ہے، اور سوال حالات کے تقاضے کا ہے، اب تک ہماری کوششیں اور ہماری صلاحیتیں، ہمارے وسائل اور ہمارے اوقات سیاسی اور تنظیمی تحریکات کی نذر ہوتے رہے ہیں، اور یہ ساری جہد وحرکت اس مفروضے پر رہی کہ قوم میں پورا پورا ایمان ہے، اور قوم کی قیادت ..... جو لامحالہ تعلیم یافتہ طبقے ہی سے ہوتی ہے .... وہ بھی پوری طرح مسلمان ہے اسلام کے عقائد ومبادی پر اس کا ایمان ہے، اسلام کی سربلندی کے لئے اس کے دل میں جوش وجذبہ ہے، اور حدود واحکام کے نفاذ کے لئے بھی وہ تیار ہے، حالانکہ بات برعکس ہے، قوم کا حال یہ ہے کہ ایمان میں ضعف اور اخلاق میں انحطاط آچکا ہے، لیکن اس کا نہ ہمیں پتہ چلا نہ خود قوم کو شعور ہوا، تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کا حال یہ ہے کہ مغربی فلسفوں اور سیاست واقتدار کے اثر سے بیشتر افراد میں عقیدہ گویا پگھل چکا ہے، بلکہ بہت سوں کا حال تو یہ ہو چکا ہے کہ اسلامی عقیدے سے کھلے باغی اور مغربی فلسفوں اور ان فلسفوں کے لائے ہوئے افکار وعقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان، ان کے لئے دنیا سے لڑجانے کا جوش وولولہ اور ان کی نشر واشاعت کا جنون، یہ فکر کہ زندگی کا نظام ان فلسفوں کی روشنی اور ان کی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور یہ کوشش کہ پوری قوم کو اس لادینیت سے مانوس کیا جائے، یہ ہے اس طبقے کے بہت سے افراد کا ذہنی حال، پھر عمل کے میدان میں بعض جلد باز ہیں، بعض تدریج کے قائل ...... بعض اس لادینی رجحان کو طاقت کے زور سے قوم پر ٹھونس دینا چاہتے ہیں اور بعض قوم کو اس شیشے میں خوبصورتی کے ساتھ اتارنے کی راہ پر گامزن ہیں، مگر منزل سب کی ایک اور مقصد وہدف سب کا واحد!

دینی طبقے کے دو متضاد گروہ

س طبقے کے بارے میں ہمارا دینی طبقہ ..... بہ شرطیکہ یہ تعبیر درست بھی ہو، کیونکہ اسلام میں کوئی مخصوص دینی طبقہ اور پاپائیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے، اپنے رویہ کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم ہے، ایک گروہ ہے جو اس سے برسر جنگ ہے، اس کی تکفیر کرتا ہے اور اس کے سائے سے بھی دور رہنا پسند کرتا ہے، لیکن ان اسباب وعلل کی جستجو سے بالکل مستغنی ہے، جنھوں نے اس طبقے میں لادینیت کا رجحان پیدا کیا، یہ گروہ اس کا قائل نہیں ہے کہ اس طبقے سے اختلاط پیدا کیا جائے، دین سے اس کی وحشت دور کی جائے، اگر کوئی ایمان وخیر کا ذرہ اس میں موجود ہے، تو اسے بڑھاوا دیا جائے، موثر اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اس کے اندر دینی افکار اتارے جائیں، اس کے جاہ ومال اور قوت واقتدار سے استغنا دکھا کر اسلامی کردار کی عظمت کا نقش قائم کیا جائے، مخلصانہ اور حکیمانہ نصیحت کی جائے، اور اس طرح اس کے احوال اور دل ودماغ کو بدلا جائے۔ دوسرا گروہ بالکل اس کی ضد ہے، وہ اس طبقے سے تعاون کرتا ہے، مال وجاہ میں اس کا شریک بنتا ہے، اس کے ذریعہ اپنی دنیا بناتا ہے، اس کا دین سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، پس اس گروہ میں نہ کوئی دعوتی روح ہے، نہ دینی غیرت کا مظاہرہ، نہ یہاں اس بگڑے ہوئے طبقے کی اصلاح کی کوئی حرص وفکر پائی جاتی ہے اور نہ اسے اس قرب وتعاون میں کوئی پیغام ملتا ہے۔

اصلاح اور دینی انقلاب کے لئے جس گروہ کی ضرورت ہے!

ایسا کوئی گروہ نہیں جو اس صورتحال پر دردمند ہو، جو یہ سمجھے کہ یہ اونچا تعلیم یافتہ طبقہ مریض ہے، مگر علاج کے لائق اور شفایابی کے قابل، اور پھر اس کے علاج کی فکر کرے، حکمت ونرمی کے ساتھ دین کی دعوت لے کر اس میں گھسے اور بے لوث نصیحت کا حق ادا کرے، ایسا کوئی تیسرا گروہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اس مغرب زدہ عنصر کو دین اور دینی ماحول سے قریب ہونے کا کوئی موقع نہیں ملتا، اس کی ساری زندگی اس ماحول سے وحشت اور دوری میں کٹتی ہے اور پھر اس بُعد ووحشت کو اہل دین کا گروہ اور بڑھا دیتا ہے، ایسے ہی وہ ایک گروہ بھی اس بُعد ووحشت میں اضافے کا سبب بنتا ہے جو دین کے نام پر اس طبقے سے جاہ ومنصب اور حکومت وسلطنت کے لئے جنگ کرتا ہے، یہ دونوں گروہ سوائے اس کے کچھ نہیں کرتے کہ اس طبقے کو دین سے خائف کریں اور ایک بغض وعناد کی کیفیت پیدا کریں، انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ دنیا کا حریص ہے تو اس معاملے میں اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کرسکتا، اگر حکومت وسلطنت ہی اس کا مقصدِ زندگی ہے تو اس میدان کے حریف کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا اور اگر بندۂ نفس اور خوگرِ عیش وعشرت ہے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اس دنیا میں کسی کو سہیم وشریک بننے کی اجازت دیدے۔

عالم اسلامی کے درد کی دوا آج وہ گروہ ہے، جو خواہشات سے بلند اور داعیانہ بے غرضی کا پیکر ہو، ہر اس بات سے دامن بچائے جس سے وہم بھی ہوسکتا ہو کہ اس دنیا کی طلب ہے یا اس کا مطمح نظر اپنے لئے، اپنی پارٹی کے لئے یا اپنے خاندان کے لئے حکومت واقتدار کا حصول ہے، وہ گروہ جو اس طبقے سے میل ملاقات کے ذریعہ، مراسلات اور گفتگو کے ذریعہ، دعوتی اسفار کے ذریعہ، پر اثر اسلامی ادب کے ذریعہ، شخصی روابط کے ذریعہ، پاکیزگی کردار اور علو اخلاق کے ذریعہ، زہد واستغناء اور پیغمبرانہ اخلاق کی پر اثر نمائندگی کے ذریعہ ان نفسیاتی اور عقلی گرہوں کو کھول دے جو مغربی علوم نے پیدا کی ہوں یا دینی طبقے کی بے تدبیری سے پڑی ہوں، یا کم فہمی، کم نظری اور اسلام اور اس کے صحیح ماحول سے بُعد ان کا سبب ہوا ہو۔

اس طرز پر کام کرنے والوں کی کامیابی

یہی وہ گروہ ہے جس سے ہر دور میں اسلام کی خدمت بن آئی ہے، اموی سلطنت کا رخ پھیر دینے اور تخت خلافت پر عمرؓ بن عبد العزیزؒ کو لا بٹھانے کا سہرا اسی گروہ کے سر ہے، جس کی نمائندگی رجاءؒ بن حیاتؒ نے کی، اور پھر ہندوستان میں مغل سلطنت میں اسی نوعیت کا انقلاب بھی اسی گروہ کا رہین منت ہے، اکبر جیسے طاقتور بادشاہ نے اسلام سے انحراف کر کے اور کھلی اسلام دشمنی پر کمر باندھ کے گویا یہ تہیہ کرلیا تھا کہ اس اسلامی براعظم کو جو چار صدیاں اسلامی حکومت کے سائے میں گزار چکا تھا، پھر پرانی جاہلیت کے سانچے میں ڈھال دے لیکن اس حکیمانہ دعوت اور ایک ایسے حکیم اور داعیٔ اسلام کے ظہور میں آنے کے طفیل، جس نے اسلام کے لئے خلوص اور اس کے تفقّہ کا حق ادا کیا اور اس کے جانشینوں کی کوششوں کے طفیل یہ ملک اک بار اسلام سے نکل کر پھر اس کے ہاتھ میں آیا..... اور پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ آیا ......اکبر کے تخت پر پے در پے ایسے بادشاہ آئے جن میں سے ہر ایک اپنے پیش رَو سے بہتر تھا، حتی کہ نوبت اورنگزیبؒ عالمگیر تک پہنچی، وہ اورنگزیبؒ جس کا ذکر تاریخ اسلام اور تاریخ اصلاح کا ایک زریں باب ہے...... اور معلوم ہے کہ تاریخ ہمیشہ دہرائے جانے اور بار بار دہرائے جانے کے لئے تیار ہے، اسے کبھی اس عمل انکار نہیں ہوا بس بات صرف اس وقت کی رہی ہے، جو اس کا رخ پھیر سکے اور اسلام کے تابندہ ادوار کو دہرا کر لانے والی قوت صرف یہی دعوت اور یہی حکمت واخلاص ہے!

سنگین صورتحال

اس صورتحال کا ہمیں ہمت واستقلال اور حکمت ودانائی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے، دنیائے اسلام پر آج ایک دینی فکری اور تہذیبی ارتداد کی سخت مصیبت آئی ہوئی ہے، یہ مصیبت ان تمام لوگوں کے غور وفکر کا موضوع بن جانی چاہئے جو اسلام کا درد رکھتے ہیں، آج ہر اسلامی ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے افراد کا حال یہ ہے کہ اعتقاد وایمان کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، اخلاقی بندشیں وہ توڑ کر پھینک چکے ہیں انداز فکر ان کا سرتا سر مادی ہو چکا ہے اور سیاست میں انہوں نے لادینیت کا نظریہ اپنا لیا ہے اگر ''اکثر'' کا لفظ بولتے ہوئے مجھے خوف بھی ہو تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان میں بہت سے ایسے ہیں، جو اسلام پر ایک عقیدے اور ایک نظام کی طرح ایمان نہیں رکھتے، اور مسلمان عوام .... باوجودیکہ ان میں خیر وصلاح کے تمام جوہر موجود ہیں، اور وہ اپنی طبیعت سے انسانیت کا صالح ترین گروہ ہیں ......اس طبقے کی علمی بالاتری، ذہنی تفوق اور اثر ونفوذ کی بناء پر اس کے ماتحت اور مطیع ہیں۔

اگر صورتحال یونہی چلتی رہی تو یہ الحاد وفساد ان عوام میں بھی گھس کر رہیگا، دیہاتوں کے سادہ دل مسلمان بھی اس کی لہروں سے نہ بچ سکیں گے اور کھیت اور کارخانوں کے مزدوروں کا بھی دین وایمان یہ پلٹ کر کے چھوڑے گا، یہ سب کچھ اسی رفتار اور انداز سے یورپ میں ہو چکا ہے، اور اگر حالات کا رخ اور رفتار یہی رہی، اور اللہ کا ارادۂ قاہرہ بیچ میں حائل نہ ہوگیا تو مشرق میں بھی یہی سب کچھ ہونے جا رہا ہے۔

کام کی فوری ضرورت

اس فریضے کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر کا موقع نہیں ہے، دنیائے اسلام کو ارتداد کی بڑی زبردست لہر کا سامنا ہے ایسی لہر جو اس کے عزیز ترین طبقوں اور بہترین حصوں میں پھیل چکی ہے، یہ اس عقیدے، اس نظام اخلاق اور ان اقدار کے خلاف بغاوت ہے، جو دنیائے اسلام کی سب سے برتر متاع ہے، اگر یہ دولت ضائع ہوگئی جو رسول (ﷺ) کا ترکہ ہے جسے نسلوں پر نسلیں منتقل کرتی ہوئی لائی ہیں، اور جس کی راہ میں اسلام کے جانبازوں نے مصائب کے کتنے ہی پہاڑ اٹھائے ہیں، تو سمجھ لیجئے کہ عالم اسلام بھی گیا۔۔۔۔

کیا ہم اس حقیقت اور وقت کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے؟؟؟؟؟؟

مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ

حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہ
سید اشباب اہل الجنہ

"حسین منّی و انا من حسین احبّ اللّٰہ من احبّ حسیناً حسین سبط من الا سباط"

"میرا یہ بیٹا سید ہے خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔"

ایک شخص نے کہا میاں صاحبزادے کیا اچھی سواری ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔

حضرت حسین بن علیؓ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے نواسے اور حضرت علیؓ وفاطمہ زہراؓ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت حسینؓ کی ولادت شعبان ۴ھ میں ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی ان کا نام حسین رکھا، ان کو شہد چٹایا، ان کے منہ میں اپنی زبان مبارک داخل کر کے لعاب مبارک عطا فرمایا اور ان کا عقیقہ کرنے اور بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت فاطمہؓ نے ان کے عقیقہ کے بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی ۔ (موطا امام مالک)

اپنے بڑے بھائی حضرت حسنؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے بھی غیر معمولی محبت اور تعلق تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو ان کی عمر صرف چھ یا سات سال تھی، لیکن یہ چھ سات سال آپ کی صحبت اور شفقت و محبت میں گزرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے خاص لطف و کرم اور محبت کا برتاؤ کیا۔ حضرت عمرؓ کے آخری زمانۂ خلافت میں آپ نے جہاد میں شرکت شروع کی ہے اور پھر بہت سے معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب باغیوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا تو حضرت علیؓ نے اپنے دونوں بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ کو ان کے گھر کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیا تھا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ نے جب حضرت امیر معاویہؓ سے مصالحت کر کے خلافت سے دستبرداری کے ارادہ کا اظہار کیا تو حضرت حسینؓ نے بھائی کی رائے سے اختلاف کیا لیکن بڑے بھائی کے احترام میں ان کے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ البتہ جب حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے یزید کی خلافت کی بیعت لی تو حضرت حسینؓ اس کو کسی طرح برداشت نہ کر سکے اور یزید کے خلیفہ بن جانے کے بعد اپنے بہت سے مخلصین کے مشورہ کو نظر انداز کر کے جہاد کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے کوفہ کے لیے تشریف لے چلے ابھی مقام کربلا تک ہی پہنچے تھے کہ واقعہ کربلا پیش آیا اور آپ وہاں شہید کر دیئے گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ تاریخ وفات ۱۰، محرم ۶۱ ھ ہے اس وقت عمر شریف تقریباً ۵۵ سال تھی۔

حضرات حسنینؓ کے فضائل ومناقب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور آپ کے صحابی ہونے کا شرف کیا کم ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرات

حسنین ؓ سے بہت محبت تھی ۔شفقت ومحبت کا یہ عالم تھا کہ یہ دونوں بھائی بچپن میں حالت نماز میں آپ کی کمر پر چڑھ جاتے کبھی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے گذرتے رہتے اور آپ نماز میں بھی ان کا خیال کرتے ۔ جب تک وہ کمر پر چڑھے رہتے آپ سجدہ سے سر نہ اٹھاتے ۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۳،ص ۲۹۴۔) آپ انہیں اکثر گود میں لیتے ،کبھی کندھے پرسوار کرتے ، ان کا بوسہ لیتے ، انہیں سونگھتے اور فرماتے "انکم لمن ریحان اللہ" تم اللہ کی عطا کردہ خوشبو ہو۔(جامع ترمذی باب ماجاء فی رحمة الولد) ایسے ہی ایک موقع پر حضرت اقرع بن حابس ؓ نے عرض کر دیا اے اللہ کے رسول! (ﷺ) میرے تو دس بیٹے ہیں لیکن میں نے آج تک کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "انہ من لا یرحم لا یُرحم" جورحم نہیں کرتا اس پر بھی من جانب اللہ رحم نہیں کیا جاتا۔ (ترمذی باب ماجاء فی رحمة الولد) آیت تطہیر کے نزول کے بعد آپ نے حضرت علی ؓ ، حضرت فاطمہ ؓ ، اور حضرات حسنین ؓ کو اپنی ردائے مبارک میں داخل فرما کر اللہ سے عرض کیا: "اللھم ھٰؤلاء اہل بیتی فاذھب عنھم الرّجس وطھّرھم تطھیراً" اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی کو دور فرما دیجئے اور پاک وصاف کر دیجئے۔ (ترمذی باب مناقب اہل بیت) صحیح بخاری میں حضرت عدی بن ثابت ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن ؓ کو اپنے کندھے پر سوار کیے ہوئے تھے اور یوں دعا کر رہے تھے "اللھمّ انی أحبه فاحبهٗ" اے اللہ یہ مجھے محبوب ہے آپ بھی اسے محبوب بنا لیجئے ۔ (صحیح بخاری ، ج ا ، باب مناقب) امام بخاری نے ہی حضرات

حسنین ؓ کے مناقب میں حضرت ابن عمر ؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ان سے کسی عراقی نے مسئلہ دریافت کیا کہ محرم میں اگر مکھی ماردے تو کیا کفارہ ہے ؟ حضرت ابن عمر ؓ نے بڑی ناگواری سے جواب دیا کہ اہل عراق مکھی کے قتل کا مسئلہ پوچھنے آتے ہیں اور نواسہ رسول ﷺ (حضرت حسین ؓ) کو قتل کر دیا حالانکہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں فرمایا تھا: "ہما ریحانتای من الدنیا" یہ دونوں میرے لیے دنیا کی خوشبو ہیں ۔ (ایضاً) " اللھم انی احبہما فاحبہما" اے اللہ میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں آپ بھی ان کو اپنا محبوب بنا لیجئے یہ دعائیہ کلمات صحیح سندوں سے حدیث کی متعدد کتابوں میں مروی ہیں اور اسمیں کیا شک ہے کہ آپ کے یہ دونوں نواسے اللہ کے بھی محبوب اور اللہ کے رسول کے بھی محبوب اور ان دونوں سے محبت رکھنے والے بھی اللہ اور اس کے رسول کے محبوب ہیں۔امام ترمذیؒ نے حضرت یعلی بن مرہ ؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔ "حسین منّی و انا من حسین احبّ اللہ من احبّ حسیناً حسین سبط من الا سباط" (جامع ترمذی باب مناقب) حسین میرے ہیں اور میں حسین کا ہوں ، جوحسین سے محبت کرے اللہ اس سے محبت کرے حسین میرے ایک نواسے ہیں۔حسین منّی وانا من حسین " کے کلمات انتہائی محبت ، اپنائیت اور قلبی تعلق کے اظہار کے لیے ہیں ، اس کے بعد وہی دعائیہ کلمات ہیں جن کے متعلق عرض کیا کہ یہ الفاظ متعدد روایات میں مذکور ہیں اس مضمون کی کئی روایات امام ترمذی نے مناقب الحسن ؓ والحسین ؓ کے عنوان کے تحت ذکر کی ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی والدہ کو

"سیدة نساء اہل الجنه " اور دونوں بھائیوں کو "سیدا شباب اہل الجنة" فرمایا ہے۔(ایضاً) رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام ؓ خصوصاً حضرات شیخین ؓ کا معاملہ بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ بہت ہی لطف وکرم کا رہا بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ آپ دونوں کو کندھوں پر بٹھاتے تھے ۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دونوں بھائیوں کا وظیفہ اہل بدر کے وظائف کے بقدر پانچ پانچ ہزار درہم مقرر کیا اور اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت بیان کی ۔ (سیر اعلام النبلاء) حالانکہ یہ دونوں حضرات ان کے دور خلافت کے آخر میں بھی بالکل نوجوان ہی تھے حضرت عمر ؓ کے زمانۂ خلافت کا واقعہ ہے کہ وہ مسجد نبوی ﷺ میں رسول اللہ ﷺ کے منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے حضرت حسین ؓ آئے اور حضرت عمر ؓ کو مخاطب کر کے کہا ، میرے باپ (نانا جان) کے منبر سے اترو اور اپنے والد کے منبر پر جا کر خطبہ دو ، حضرت عمر ؓ نے کہا میرے باپ کا تو کوئی بھی منبر نہیں ہے یہ کہا اور ان کو اپنے پاس منبر پر بٹھا لیا اور بہت اکرام اور لطف ومحبت کا معاملہ کیا ۔ (ایضاً) انہیں حضرت عمر ؓ کے زمانہ خلافت میں یمن سے کچھ حُلے (چادروں کے جوڑے) آئے ، آپ نے وہ صحابہ کرام ؓ کے لڑکوں میں تقسیم کر دیئے اور حضرات حسنین ؓ کے لیے ان سے بہتر حلے منگوائے اور ان دونوں بھائیوں کو دیئے اور فرمایا اب میرا دل خوش ہوا ہے۔ (ایضاً) یہ دونوں بھائی اگر چہ کثیر الروایات نہیں لیکن پھر بھی براہ راست رسول اللہ ﷺ اور اپنے والدین سے احادیث رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نقل کرتے ہیں۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں بھائی بہت ہی عبادت گزار تھے، دونوں نے بار بار مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک پیدل سفر کر کے حج کئے ہیں۔ اللہ کے راستہ میں کثرت سے مال خرچ کیا کرتے تھے۔ جود وسخاوت، ماں باپ اور نانا جان سے وراثت میں ملی تھی۔ رضی اللہ عنہما وارضاہما۔ (معارف الحدیث)

فضائل حسنین رضی اللہ عنہما

یوں تو حضرات حسنینؓ کی ذات گرامی مجمع الفضائل تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی محبت وشفقت آپ کی فضیلت کا نمایاں باب ہے کتب احادیث وسیر کے ابوب الفضائل ان دونوں کے فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ فضائل نقل کئے جاتے ہیں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دونوں بھائیوں کے ساتھ یکساں محبت تھی اس لیے بعض امتیازی اور انفرادی فضائل کے علاوہ عموماً اور بیشتر دونوں کے فضائل اس طرح مشترک ہیں کہ ان دونوں کا جدا کر کے لکھنا مشکل ہے اس لیے دونوں کے فضائل لکھ دیئے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے تمام اہل بیت میں حضرات حسنینؓ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ اہل بیت میں مجھ کو حسنؓ وحسینؓ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ (ترمذی)۔ آپ خدا سے بھی اپنے ان محبوبوں کے ساتھ محبت کرنے کی دعا فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قینقاع کے بازار سے لوٹا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا بچے کہاں ہیں؟ تھوڑی دیر میں دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چمٹ گئے آپ نے فرمایا خدایا میں ان کو محبوب رکھتا ہوں اس لیے تو بھی انہیں محبوب رکھ اور ان کے محبوب رکھنے والے کو بھی محبوب رکھ۔ (مسلم) دوسری روایت میں ان کا بیان ہے کہ اس شخص (حسنؓ) کو اس وقت سے میں محبوب رکھتا ہوں جب سے میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں دیکھا، یہ ریش مبارک میں انگلیاں ڈال رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زبان ان کی منہ میں دے کر فرماتے تھے کہ خدایا میں ان کو محبوب رکھتا ہوں اس لیے تو بھی محبوب رکھ۔ (مستدرک) حضرت حسنؓ کو دوش مبارک پر سوار کر کے خدا سے دعا فرماتے تھے کہ خداوند میں اس کو محبوب رکھتا ہوں اس لیے تو بھی محبوب رکھ۔ (ترمذی) عبادت کے موقع پر بھی حسنؓ وحسینؓ کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ابوبریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں حسنؓ وحسینؓ سرخ قمیص پہنے ہوئے خراماں خراماں آتے ہوئے دکھائی دیئے انہیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے اتر آئے اور دونوں کو اٹھا کر اپنے سامنے بٹھالیا اور فرمایا خدا نے سچ کہا کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں ان دونوں بچوں کو خرامان خراماں آتے ہوئے دیکھ کر میں ضبط نہ کر سکا اور خطبہ توڑ کر ان کو اٹھالیا۔ (ایضاً) حضرات حسنینؓ نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے ساتھ طفلانہ شوخیاں کرتے تھے، لیکن آپ نہ انہیں روکتے تھے اور نہ ان کی شوخیوں پر خفا ہوتے تھے بلکہ ان کی طفلانہ اداؤں کو پورا کرنے میں امداد دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھتے وقت رکوع میں جاتے تو حسنؓ وحسینؓ دونوں ٹانگوں کے اندر گھس جاتے، آپ ان دونوں کے نکلنے کے لیے ٹانگیں پھیلا کر راستہ بنا دیتے۔

(تہذیب التہذیب، ج، ۲)۔

آپ سجدہ میں ہوتے تو دونوں جست کر کے پشت مبارک پر بیٹھ جاتے آپ اس وقت تک سجدہ سے سر نہ اٹھاتے جب تک دونوں خود سے نہ اتر جاتے (اصابہ، ج، ۲) دوش مبارک پر سوار کر کے کھلانے کے لیے نکلتے، ایک مرتبہ آپ حسنؓ کو کندھے پر لے کر نکلے ایک شخص نے کہا میاں صاحبزادے کیا اچھی سواری ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔ (ترمذی) کبھی کبھی دونوں کو چادر میں چھپائے ہوئے باہر تشریف لاتے۔ اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شب کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک ضرورت سے گیا آپ کوئی چیز چادر میں چھپائے ہوئے تشریف لائے میں اپنی ضرورت پوری کر چکا تو پوچھا آپ چادر میں کیا چھپائے ہیں؟ آپ نے چادر ہٹادی تو اس میں سے حسنؓ وحسینؓ برآمد ہوئے۔ آپ نے فرمایا یہ دونوں میرے بچے اور میری لڑکی کے لڑکے ہیں۔ خدایا میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں اس لیے تو بھی ان کو محبوب رکھ اور ان کے محبوب رکھنے والے کو بھی محبوب رکھ (ترمذی)

نبوت کی حیثیت کو چھوڑ کر جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشری حیثیت کا تعلق ہے حضرات حسنینؓ کی ذات گویا ذاتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جزو تھی، یعلیؓ بن مرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حسینؓ مجھ سے ہیں اور میں حسینؓ سے

ہوں، جو شخص حسین کو دوست رکھتا ہے خدا اس کو دوست رکھتا ہے حسینؓ اسباط کے ایک سبط ہیں۔(ایضاً) حسنؓ وحسینؓ کو آپ اپنے جنت کے گل خندان فرماتے تھے ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ حسنؓ و حسینؓ میرے جنت کے دو پھول ہیں (بخاری)

حسنؓ وحسینؓ نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ حذیفہؓ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی عشاء کی نماز کے بعد آپ ﷺ تشریف لے چلے میں بھی پیچھے ہولیا میری آواز سن کر آپ نے فرمایا کون؟ حذیفہ! میں نے عرض کیا، جی! فرمایا خدا تمہاری اور تمہاری ماں کی مغفرت کرے تمہاری کوئی ضرورت ہے؟ دیکھو ابھی یہ فرشتہ نازل ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اس کو خدا نے اجازت دی ہے کہ وہ مجھے سلام کہے اور مجھے بشارت دے کہ فاطمہ جنت کے عورتوں کی اور حسنؓ و حسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ (ترمذی)

انفرادی فضائل

ان مشترک فضائل کے علاوہ حضرت حسنؓ کے کچھ امتیازی فضائل الگ ہیں جو انہیں حضرت حسینؓ سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان فضائل میں سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے متعلق پیشن گوئی فرمائی تھی کہ ''میرا یہ بیٹا سید ہے خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔(مستدرک) حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کے وقت حضرت حسنؓ نے اس پیشن گوئی کی عملی تصدیق فرمائی ایک موقع پر فرمایا کہ حسنؓ کو میرا حلم عطا ہوا ہے۔(سیر الصحابہؓ)

ولادت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

حضرت حسینؓ بن علیؓ پانچویں شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے رسول اللہ ﷺ نے شہد چٹایا اور ان کے دہن پاک کو اپنی زبان بابرکت سے تر کیا، ان کو دعائیں دیں اور حسینؓ نام رکھا، آپؓ کا چہرۂ مبارک رسول اللہ ﷺ کے چہرہ انور سے مشابہ تھا اور حضرت حسینؓ کا جسم پاک رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کے مشابہ تھا، وفات نبوی کے وقت میں حضرت حسینؓ کی عمر ساڑھے چھ سال کی تھی۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک روز میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا حسنؓ وحسینؓ دونوں آپ کے صدر مبارک پر چڑھے کھیل رہے تھے، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! (ﷺ) کیا آپ ان دونوں سے اس درجہ محبت کرتے ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں! یہ دونوں دنیا میں میرے پھول ہیں۔ (الطبرانی فی المعجم) حضرت حارثؓ حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔ حسنؓ اور حسینؓ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ یزیدؒ بن ابی زیاد کی روایتوں میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرات حسنین کے رونے کی آواز سنی تو ان کی والدہ سے کہا:۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ ان کا رونا مجھے اندوہگیں کرتا ہے۔ (الطبرانی)۔ حضرات حسنینؓ نے اس جنگ میں بھی شرکت فرمائی تھی جس نے ۵۱ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا، اس حملہ میں یزید بن معاویہؓ بھی تھے۔ (البدایہ والنہایہ) حضرت حسینؓ بہت عبادت گزار تھے، نماز روزہ اور حج کا بہت اہتمام فرماتے تھے، آپؓ نے بیس حج پا پیادہ کیے تھے۔ (الجوہرۃ)

حضرت حسینؓ بن علیؓ انتہائی متواضع تھے، ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار گزر رہے تھے، غرباء کی ایک جماعت نظر آئی جو زمین پر بیٹھی روٹی کے ٹکڑے کھارہی تھی، آپ نے ان کو سلام کیا، ان لوگوں نے کہا ''ھلمّ یاابن رسول اللہ'' (ﷺ)! اے فرزند رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمایئے! آپ گھوڑے سے اتر کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور کھانے میں شریک ہوئے، آپ نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی۔

'' اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِيْنَ '' (سورہ النحل)

اللہ تبارک وتعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا حضرت حسینؓ جب ان لوگوں کے روٹی کے ٹکڑوں پر شرکت فرماچکے اور فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا:، بھائیو! آپ نے مجھے دعوت دی میں نے قبول کیا، اب آپ سب میری دعوت قبول کیجئے، ان لوگوں نے بھی دعوت قبول کی، اور آپ کے مکان پر آئے جب سب آکر بیٹھے تو آپ نے فرمایا:، رباب! لانا جو بھی بچا ہوا محفوظ رکھا ہے۔ (الجوھرہ)

حضرت ابن عینیہؒ نے کہا کہ عبداللہؓ بن ابی زید سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا:۔ میں نے حسینؓ بن علیؓ کو اس وقت دیکھا جب آپ کے سر اور ریش مبارک کے بال سیاہ تھے، سوائے چند بالوں کے جو ریش مبارک کے اوپری حصہ میں سفید تھے۔ عمرؒ بن عطا نے کہا: حضرت حسینؓ کو میں نے وسمہ (ایک طرح کا خضاب) سے بال رنگتے ہوئے دیکھا ہے، ان کے سر اور ریش کے بال بالکل سیاہ تھے۔

(سیر اعلام النبلاء)، (المرتضی)۔

نظامِ اسلام اور ہمارا کردار ؟؟؟

مولانا محمد احمد غازی

جس کے مکان میں جگہ ہو یا نہ ہو لیکن اسکا دل مسلمانوں کے لیے وسیع ہو، جو اپنے اس دل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو ”خوش آمدید“ کہیں،
جب کسی زمین پر اللہ کا نظام نافذ ہو جاتا ہے تو اس پر آنے والے زلزلے بھی ایک کوڑے کی ضرب سے رک جایا کرتے ہیں۔
لیکن ذرا سوچیے اے میری قوم! کیا ہمیں بھی اسلام نے ہر معاملے میں اس طرح کی مکمل مادر پدر آزادی دے رکھی ہے؟

پاکستان کی تاریخ کا ایک بدترین حادثہ! جس نے بہت سے چہروں کو بے نقاب کیا، تو بہت سے چہروں کو نقاب پوش کردیا۔ یقیناً یہ واقعہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے طے شدہ امور میں سے تھا، یہ ایک تکوینی معاملہ تھا جس کے لیے کچھ خوش نصیب چہرے چنے جانے تھے تو مدِّ مقابل کچھ بدنصیب بھی۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ خوش نصیب لوگ کون تھے اور دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ ان خوش نصیب، سعادتوں، شہادتوں کے حامل افراد کے مقابل کن کی بدبختی اور بدنصیبی انہیں کھینچ لائی۔ لیکن دوستو! یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے تھا، یہ ہونا تھا، اس کے کردار چنے جانے تھے، وہ چنے گئے۔ دنیا نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ نے اپنی سعادتیں اور کچھ نے اپنی شقاوتیں واضح کردیں۔ یہ ہونا تھا کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، کوئی اور صورتحال نظر نہیں آرہی تھی مدتوں بیت گئے تھے اس زمین سے اللہ کے نظام کا خاتمہ کئے ہوئے۔ گو کہ پوری دنیا میں کہیں بھی نظامِ خدا نا پید ہو چکا تھا اور کیا اپنا کیا پرایہ؟ سب کی یہی کوشش جاری تھی کہ آئندہ کبھی اللہ کا نظام اللہ کی زمین پر نہ آسکے۔ پوری دنیا کی زمین بالخصوص پاکستان کی سرزمین نہ جانے کب سے بیقرار تھی۔ وہ زمین جس کی بنیاد ”لاالہ الا اللہ“ کی بنیاد پر رکھا گیا تھا جس کے لیے خون اگر مانگا گیا تو ”لاالہ الا اللہ“ کی بنیاد پر۔ وہ زمین جس نے لاکھوں شہداء کو اپنے پیٹ میں صرف اس امید پر سمولیا کہ اس سے ایسا برگ وباراں رنگ لائے گا، جان دینے والوں نے بھی جانیں دیں تو اسی امید پر شاید کہ آنے والی نسلیں اسلامی نظام کی بہاریں دیکھ لیں، یہ زمین نہ صرف اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنے بلکہ اس زمین کو اسلامی نظام کے لیے محنت کرنے کے بعد قابلِ تقلید بنایا جائے۔ اور اسکے پھلوں، پھولوں سے آنے والی نسلیں مستفید ہوں۔ جہاں اسلامی اصولوں کو نافذ کیا جائے، جو حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی ”آزاد“ سرزمین ہو۔ جس کے مکان میں جگہ ہو یا نہ ہو لیکن اسکا دل مسلمانوں کے لیے وسیع ہو، جو اپنے اس دل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو ”خوش آمدید“ کہیں، جس کی سرحدیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے کھلے ہوں، جہاں مسلمانوں میں وحدت ہو، سارے مسلماں ایک جسم کے مانند ہوں، اگر برما کے کسی مسلمان کو کوئی کانٹا چبھے یا شام میں کوئی مسلمان مظلوم ہو تو پاکستان میں بسا مسلمان بے قرار ہو جائے، اس کی راتوں کی نیند اڑ جائے، (کم از کم اس صورتحال میں تو ایسا ہونا چاہیے تھا کہ اپنے مظلوم بھائیوں کے لیے سرحدات کا تصور ختم ہو جاتا اور پوری قوم باہیں پھیلائے ان کی منتظر ہوتی۔ لیکن افسوس!) جہاں عدل وانصاف ”کوڑیوں“ کے بھاؤ نہ بکتا ہو، جہاں امن کے ٹھیکیدار ”رشوتوں“ پہ نہ جیتے ہوں، جہاں مالک اور ملازم دونوں کی عزت

نفس کا خیال رکھا جائے ،عزت اور ذلت کی کسوٹی مال نہ ہو، جہاں مملکت کا بادشاہ، سلطان، خلیفہ اپنے رعایا پر بمثلِ مہربان باپ کے ہو۔لیکن کئی زمانے یہ انتظار کرتے کرتے گزر گئے ، زمانوں نے دیکھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ، مظلوم مسلمانوں کو پناہ دینا تو دور کی بات ہم تو الٹا اپنے ہی مسلمان بھائیوں بہنوں کو ڈالروں کے عوض کفار کو'' فروخت'' کرتے رہے ۔ اسلامی نظام نافذ کرنا تو دور کی بات ! ہم تو نظامِ خدا کے نفاذ کا'' پرامن'' مطالبہ کرنے والوں پر گولیاں برسا کر ان کا امن خراب کرتے رہے ۔ بلکہ ہم بھی مِن حیث القوم اس جرم میں برابر کے شریک ہو گئے ، کیونکہ ظالم کے ظلم پر خاموش رہنا بھی تو اس کی معاونت ہی ہے نا! ہم دیارِ غیر کے بھائی بہنوں کو تو خیر کیا پناہ دیتے ہم نے تو اپنی'' بہن ڈاکٹر عافیہ'' بھی امریکیوں کے حوالے کر دی۔ اور اب وہ کفار کی قید میں ہمارے غیرت کا نوحہ کرتی ہے۔لیکن ہم تو ڈالر کی آس پر اندھے ہو گئے ، آنکھیں بند کر لیں ہم نے ہر ستم پر، عاری ہو گئے ہم ہر دینی، ملی وقومی جذبۂ اخوت وغیرت سے ۔ان تمام صورتحال پر مِن حیث القوم ہمارا خاموش رہنا یقیناً کسی بڑے طوفان کی آمد سے پہلے والی خاموشی کے مترادف تھا۔ اور ایسے میں اللہ تعالی کی طرف سے کچھ کیا جانا لازم ٹھہرا۔ سو'' لال مسجد'' کا دلسوز سانحہ پیش آیا، جی ہاں! '' دلسوز اور دل خراش سانحہ'' جس نے دلوں کو چھلنی کر دیا ۔ مگر جانے والے اپنے گرم گرم لہو سے ہمیں کوئی بھولا ہوا سبق یاد دلا گئے ، جی ہاں ! خلافت کا سبق، نظامِ جاہلیت سے برأت کا سبق ! جی ہاں ! وہ بتا گئے کہ امت کی بے کسی کا ذمہ دار یہ جاہلانہ نظام ہے ۔ امت کی مظلومیت کا ذمہ دار یہ

طاغوتی نظام ہے۔ آج ہم اگر اپنے ہی'' آزاد ملک'' میں Imf اور World bank جیسے اداروں کے غلام ہیں ۔ جی ہاں ! یہ سب اسی نظام کی نحوست ہے۔ آج ہم اگر اپنے ملک میں قدرتی ذخائر ہونے کے باوجود دوسرے ملکوں کے محتاج ہیں تو یہ انہی مغرب سے مستعار لیے گئے نظام کی'' برکت در بے برکتی'' ہے ۔ جب سے ہم نے اللہ کے دین کو بطورِ قانون بطورِ حکمرانی اور بطورِ طرزِ حکمرانی کے ٹھکرا دیا تب سے ہی شقاوتوں کا یہ سفر ہمارا مقدر ٹھہرا ۔ ہمارے پاس گیس کے ذخائر موجود ہیں، لیکن گیس کی لوڈ شیڈنگ کے شکار بھی ہم خود ہیں ۔ وجہ یہی جاہلانہ نظام ! ہمارے پاس بجلی بنانے کے بھی مواد اور مواقع دونوں موجود ہیں ، لیکن ہم نہ خود بنائیں گے نہ کسی کو بنانے دیں گے ۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس نظام کے ٹھیکیداروں کے جیب میں جب تک کچھ نہیں جائیگا، اے میری بھولی بھالی قوم ! آپ کے مفاد کے لیے کوئی منصوبہ تکمیل تو خیر کیا ہوگا ، زیرِ تعمیر منصوبہ بھی روک دیا جائیگا ۔ ملک ہمارا، وسائل ہمارا لوگ ہمارے ، لیکن بجلی گیس اور دیگر اشیائے زندگی کی قیمتیں مقرر کرے تو'' Imf'' جیسے پورا کرنے کے لیے ہمارے 'بیچارے حکمران'' ٹیکس پر ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ لیکن نہ حکمرانوں کا پیٹ بھر رہا ہے، نہ ہی حکومت کی تجوری۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، کیا اس نظام کو ہم صرف گیس بجلی کے لوڈ شیڈنگ اور آٹا چینی کی مہنگائی کی وجہ سے ٹھکرا دیں؟ یا پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہم نے جب یہ نظام مغرب سے مستعار لیا اور اسی نظام کی وجہ سے ہم ان ساری پریشانیوں کا شکار ہیں، تو بذاتِ خود مغرب کو بھی ان تمام پریشانیوں کا سامنا

ہونا چاہیے ۔لیکن وہاں تو ہمیں اتنی خراب صورتحال نظر نہیں آ رہی ۔ تو عرض یہ ہے اے میری قوم کے لوگو! اول تو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انہیں دنیا میں ہی سب کچھ دے دیا آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور ویسے بھی ان کی پریشانیاں ہمیں نظر نہیں آتی اور انہیں بھی اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کا فن خوب آتا ہے ۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس نظام کو اگر ٹھکراتے ہیں تو ہمارا پیشِ نظر دنیاوی عیش وآرام ہر گز نہیں ہے ۔ ایسا نہیں ہے اے میری قوم! کہ ہم آپ کی راحت نہیں چاہتے ۔ لیکن ایک مسلمان کی نظر دنیاوی راحتوں کے بجائے اُخروی اور ہمیشہ کی راحتوں پر ہونی چاہیے ۔لیکن ہاں یاد رکھیے! جب کسی زمین پر اللہ کا نظام نافذ ہو جاتا ہے تو اس پر آنے والے زلزلے بھی ایک کوڑے کی ضرب سے رک جایا کرتے ہیں ۔ اور صرف ایک خط کی بدولت بھی دریائے نیل اپنی سالوں پرانی خونی رسم کو بھلا کر پہلے سے بھی زیادہ روانی کے ساتھ جاری ہو جاتا ہے ۔ جی ہاں! یہ سچ ہے کہ جب کسی زمین پر اللہ کا نظام نافذ ہو جاتا ہے تو وہ زمین اپنی برکتیں اپنے رہنے والوں پر ظاہر کر دیتی ہے ۔تاریخ کی کتابوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ بنو امیہ کے دور میں جو گندم تھی اس کا ایک دانہ کھجور کی گھٹلی کے برابر تھا ۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا، تو کیا آپ نے علماء سے نہیں سنا کہ جب حضرت امام مہدی علیہ الرضوان اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کریں گے تو ایک انار پورے ایک خاندان کو کافی ہوگا ۔ کبھی سوچا ہے یہ کیا ہے، یہ ہے برکت اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کے نفاذ کا ۔ کبھی سوچا یہ کیسے ہوگا؟ جیسے بھی ہوگا، لیکن ہوگا جب ہمارے پیارے نبی ﷺ

نے فرمادیا ہے، تو ہمارا یقین ہے کہ ایسا ہوگا۔ کبھی غور تو کیجیے اے میری قوم! ان سیکولر، لبرلز، ملحدانہ نظریات کے حامل مغرب، جن سے ہم نے یہ نظام مستعار لیا ہے ان کے ہاں تو برکت نام کی کوئی اصطلاح سرے سے ہے ہی نہیں نا! وہ کیا جانیں برکت اور بے برکتی کا فرق۔ پھر ایک بات یہ ہے کہ ہمارا اللہ پر ایمان ہے۔ اور ہم نے جب اللہ پر ایمان لایا اور ہم نے کہا "لاالٰہ الّا اللہ" کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس اقرار کے تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ ہم نے کہا: "لامسجود الا اللہ" سجدے کے لائق بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر ہم نے کہا "ولا حاکم الّا اللہ" کہ فیصلہ کرنے والا بھی اے اللہ آپ کے سوا کوئی نہیں۔ کیا ہم نے صرف عبادت کے معاملے میں ہی اللہ کو الٰہ مانا؟ نہیں! بلکہ ہم نے "محمدٌ رّسول اللہ" پڑھ کر یہ بھی اقرار کیا کہ آپ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں پر ہی چل کر اپنی زندگی گزاریں گے۔ اور آپ ﷺ کے ذریعے جو خدائی احکامات ہم تک پہنچے ہیں ان سب کو اپنی زندگی پر نافذ کریں گے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ: کیا اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنی ذاتی زندگی سے بے دخل کر کے ہمارا دعوائے اسلام سچ ہے؟ گویا کہ عبادت تو اے اللہ ہم آپ ہی کی کریں گے، لیکن اپنی جدید، ماڈرن اور اسٹائلش زندگی کے فیصلے کروانے کے لیے ہمیں آپ کی کتاب اور آپ کے رسول اللہ ﷺ کی سنت (نعوذ باللہ) کافی نہیں ہے، اسی لیے ہم فیصلے کسی اور سے کروائیں گے۔ قولاً تو ہم ایسے نہیں ہیں، لیکن کیا عملی طور پر ہم واقعی ایسا نہیں کر رہے؟ سوچیے، ضرور سوچیے! اے میری قوم! کیا

ہمارے لیے آپ ﷺ زندگی گزارنے کا معیار نہیں ہے؟ یا پھر کیا (العیاذ باللہ) ہماری زندگی کا کوئی ایسا گوشہ شریعت نے چھوڑ دیا ہے جس کے بارے میں اس نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو، جس کے متعلق رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہم غیروں کے دروازہ پر بھیک مانگتے پھریں۔ یقیناً ایسا نہیں ہے بلکہ کمی ہماری سمجھ میں ہے۔ شریعت نے طہارت سے لیکر نماز کی امامت تک اور بچہ کی پیدائش سے لیکر اس بچے کے قبر میں اتر جانے تک ہر ہر معاملے میں نہ صرف یہ کہ ہماری رہنمائی کر دی بلکہ رہنمائی کا حق ادا کر دیا۔ پھر بھی ان سب کے باوجود ہم غیروں سے نظام برائے تجربہ کیوں لیں؟ در در کی ٹھوکریں کھانے کے بجائے ہم اسی نظام کو کیوں نہیں اپنا لیتے جو ہمیں ہمارے خالق و مالک نے دیا ہے اس حالت میں کہ وہ جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نقصان۔ ہم اُس نظام سے کیوں منہ پھیر رہے ہیں؟ ہم اسی پر اپنا تجربہ کیوں نہیں کر لیتے؟ ویسے بھی ایک مسلمان تو کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی اس بات کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگی اسلام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے، قرآن و حدیث کی روشنی میں گزارے گا۔ جبکہ کفار اس دنیا میں ایسی کسی بات کے پابند نہیں ہیں۔ دنیا میں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل آزادی ہے جو چاہیں وہ کرتے پھریں۔ لیکن ذرا سوچیے اے میری قوم! کیا ہمیں بھی اسلام نے ہر معاملے میں اس طرح کی مکمل مادر پدر آزادی دے رکھی ہے؟ کیونکہ انہوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات پر ایمان لایا اور نہ ہی نبی آخر الزمان ﷺ کی نبوت کے قائل ہوئے، کہ ان پر اسلام

کے احکام کو بجالانا لازم ہوتا۔ ایمان تو ہم نے لایا اللہ کی پاک ذات پر۔ اپنے آپ کو مسلمان تو ہم کہلاتے ہیں۔ اقرار تو ہم نے کیا رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا۔ کہیں ایسا تو نہیں؟ کہ ہم اپنے اقرار پر قولاً تو قائم ہیں لیکن عملاً پھر گئے ہوں۔ بات سوچنے کی ہے، اور مقام غور وفکر کا ہے۔ کہیں ہم یہ تو نہیں سوچنے لگے کہ "ملا کی دوڑ مسجد تک" دین کا کیا کام کہ وہ ہماری ذاتی زندگی پر دخل انداز ہوں، ہم اپنی زندگی جیسے چاہے گزاریں، دین کو مسجد تک محدود کر دو، اور ریاست اور سیاست اپنی مرضی سے چلاؤ مادر پدر آزاد معاشروں کی طرح کہ جس کے لیے اس کے بنانے والوں نے کوئی نظامِ زندگی پہلے سے مقرر نہیں کیا ہوتا۔ یاد رکھیے! یہ فلسفہ ملحدوں، کافروں اور دین بیزار طبقوں کا ہے: کہ جن کے نزدیک دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا ہمیں یاد نہیں شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کیا کہا تھا:

جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

کہیں ایسا تو نہیں؟ کہ ہم نے بھی ملحدوں کا نظریہ اپنا لیا، یا پھر کہیں ہم بھی (معاذ اللہ) دین سے ہی بیزار ہو گئے ہوں۔ فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ ہم کیا ہیں؟ ہم اس نظام کو صرف اس لیے نہیں ٹھکراتے کہ اس میں کرپشن ہے، وڈیرہ شاہی ہے، جاگیرداری ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظام ہے، ٹھیک ہے یہ سب کچھ ہے۔ ظاہر ہے جو شخص کروڑوں لگائے گا ایک سیٹ کے پیچھے تو یقیناً وہ اربوں کمانا بھی چاہے گا۔ حق ہے اس کا بھئی۔ Invest جو کیا ہے۔ Profit تو لے گا نا! ہم تو اس نظام کو اس لیے ٹھکراتے ہیں کہ یہ نظامِ جاہلیت (جمہوریت) اسلامی نظام (خلافتِ راشدہ

) کی ضد ہے، سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ اس کا سب سے بنیادی اور اہم طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے لیے (معاذاللہ) قانون ساز چنتے ہیں ۔ جو اسمبلیوں میں بیٹھ کر ہمارے لیے قانون بناتے ہیں۔ گویا کہ (معاذ اللہ) ہمیں ہمارے مالک نے اس دنیا میں بھیج تو دیا مگر ہمارے لیے کوئی قانون نہیں بنایا، جس کی بدولت ہمیں خود قانون سازی کرنی پڑ رہی ہے۔ کمال ہے یارو! کہ ہم تو اپنے ایک چھوٹی سی فیکٹری، آفس، یا کسی بھی ادارے میں کام کرنے والے اپنے اسٹاف کے لیے کوئی نہ کوئی اصول بناتے ہیں۔ اور ہمارے مالک وخالق نے ہمارے لیے کوئی اصول نہیں بنایا ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے یارو! پھر بھی کیا ایک مسلمان کے لیے یہ کسی طرح مناسب ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول اللہ (ﷺ) کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے کوئی قانون بنائے جس میں وہ قرآن وحدیث سے بھی رہنمائی لینے کا پابند نہ ہو بلکہ وہ چاہے تو کسی کالے گورے انگریز کی کسی کالی کتاب سے کوئی قانون لے لے، چاہے تو برٹش لاء سے کوئی اصول منتخب کرلے اور اس پر اپنا قانون بنالے بے شک وہ قرآن وحدیث کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ پھر جب سارے "قانون ساز" مل کر کسی مسئلہ پر متفق ہوجائیں تو وہ ہمارے پیارے ملک کا آئین بن جاتا ہے اور مقدس ٹھہرتا ہے۔ جبکہ وہ شریعت کے مقابل ایک کالا قانون ہوتا ہے لیکن ملکی آئین کے مطابق اس کا احترام ہم پر فرض ہوتا ہے، جبکہ اللہ کے قانون کے مطابق اس کو نہ ماننا ہم پر فرض ہے۔ اب ہم ہی فیصلہ کریں ہم کیا کریں؟ کیونکہ شریعت نے واضح اور دو ٹوک فیصلہ سنا دیا ہے "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعصِيَةِ خَالِقِهِ" جہاں خالق کی نافرمانی ہورہی ہو وہاں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں (حرام ہے)۔ بے شک وہ کوئی وقت کا ابدال ہی کیوں نہ ہو۔ سب مل کر سوچیے اے میری مظلوم قوم! ہم اب تک کس کا ساتھ دیتے آئے ہیں، کس کا ساتھ دے رہے ہیں، اور آئندہ کس کا ساتھ دیں گے؟ ہمیں اپنے رب کی بندگی میں جینا ہے یا رب کے بندوں کی غلامی میں زندگی بسر کرنی ہے؟ سوچیے، کیونکہ، فیصلہ ہم ہی نے کرنا ہے! ویسے بھی ہم جو دن رات مغرب کا وظیفہ جپتے رہتے ہیں، کیا کبھی ہم نے سوچا کہ یہ جو برطانیہ کا قانون ہے کہ ایک بچے کو بالغ ہوکر برسرِ روزگار ہونے تک اس کا معقول وظیفہ مقرر کیا جاتا ہے کیا اسے آپ جمہوریت کا حسن کہیں گے ہم اگر ایسا کہیں گے تو یقیناً یہ ناانصافی ہوگی۔ مغرب نے تو یہ اصول بھی خلافت راشدہ کے دور سے لیا ہے اور ہم ہیں کہ مغرب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اپنے جوتے تک گھسائے جارہے ہیں۔ لیکن نوکری بھی ہمیں نہیں مل رہی۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ مغرب تو درحقیقت اسلام ہی کے مقرر کردہ ضابطۂ اخلاق اور ضابطۂ حیات کو چُرا کر اپنا نظامِ زندگی چلا رہا ہے۔ اس کے پاس تو اپنا کوئی نظام سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس معاملے میں تو مغرب یتیم اور کنگلا ہے۔ اور ہم ہیں کہ مسلمان ہونے کے باوجود ان کے پیچھے دوڑ کر اپنی وحدت تک کھو چکے ہیں۔ اور مغرب ہی کے پیچھے منتشر ہوئے جارہے ہیں۔ اسی انتشار سے بچا کر مسلم امہ کو وحدت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور بکھری ہوئی مسلم امہ کو ایک امت "كَجَسَدٍ وَاحِدٍ" بنانے کے لیے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے شہدائے کرام (رحمہم اللہ) نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اور آج اس واقعہ کو بیتے ۸ سال ہوگئے زمانہ ان زخموں کو لے کر چپ چاپ گزرا جارہا ہے۔ نہ جانے کب کوئی طوفان پھر جاگ جائے۔ کیا ہم بھول رہے ہیں کہ ان کا پیغام کیا تھا؟ مقصد کیا تھا؟ وہ جلتے آنچل، دریدہ دامن، پھٹی ردائیں بہنوں کی چیخیں، خون میں لت پت تڑپتی لاشیں، وہ بوڑھی ماں، وہ بطلِ عظیم، شہید ابنِ شہید، امامِ زمانہ، کہیں ہم نے ان کے پیغام کو بھلا تو نہیں دیا؟۔ ان کا پیغام کیا تھا، ان کا خون کیوں گرایا گیا؟ وہ تو اپنی جان اللہ کے حضور پیش کرتے ہوئے بھی امت کو یہ پیغام دے گئے کہ " اگر اس طاغوتی نظام سے چھٹکارا ہمارے جانوں کے جانے سے حاصل ہو جاتا ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔" وہ تو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اپنی جان تک دے گئے۔ لیکن دوستو! سوال یہ ہے کہ میں اور آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا میری اور آپکی کوئی ذمہ داری نہیں بنتی؟ اٹھیے اپنی ذمہ داری پورا کیجیے۔ لیکن ہاں، یاد رکھیے! کہ آپ کی یہ جدوجہد راہِ اعتدال سے ہٹنے نہ پائے آپ کی نگاہ ہردم شریعتِ مطہرہ پر ہونی چاہیے ہر وہ کام جس سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اسے ترک کردیجیے۔ اور قرآن وسنت کی روشنی میں اپنا جدوجہد جاری رکھیے۔ کیا سوچ رہے ہیں؟ دیر مت کیجیے۔ حالات بدل رہے ہیں، مایوسی کے بادل چھٹ رہے ہیں، ابرِ رحمت برسنے کو تیار ہے رحمتِ خداوندی جوش میں ہے، آپ بھی اپنا دامن بھرنے کے لیے مستعد ہوجائیں۔ اللہ آپکا اور ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین یارب العالمین!!!!

تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہماری زندگی

اصلاحِ احوال کے حوالے سے ایک فکر انگیز تحریر

مولانا اسلم شیخو پوریؒ

کہاں وہ فخرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سراپا عمل تھا، اس کی سیرت ''قرآن کی تفسیر'' اور اس کا کردار حکمِ الٰہی کی ''زندہ تعبیر'' شفافیت ایسی کہ بدترین دشمن کو بھی قول وعمل کے تضاد کا طعنہ دینے کی جرأت نہ ہوئی، معاملہ عبادت و ریاضت اور شب بیداری کا ہو یا ذکر و تلاوت اور نفلی روزوں کا، مسئلہ ایفائے عہد، امانت و دیانت اور قول کی سچائی کا ہو یا شجاعت وسخاوت اور ایثار واحسان کا، جو کچھ زبان مبارک سے ارشاد فرمایا سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا، بلکہ خود عزیمت پر عمل کیا دوسروں کے لیے رخصت کو پسند فرمایا۔ خود مسلسل روزے رکھتے مگر صحابہؓ کو اس کی اجازت نہ دیتے، لوگوں کو صرف یہ حکم تھا کہ اپنی کمائی میں سے کچھ مستحقین کو بھی دے دیا کرو مگر خود اپنا عمل یہ تھا کہ گھر میں جو کچھ ہوتا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیتے، بلکہ بسا اوقات قرض لے کر بھی حاجت مندوں کی ضرورت پوری فرماتے۔ خندق کے موقع پر بھوک نے سارے لشکر کو پریشان کر دیا مگر دو پتھر سپہ سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی کے پیٹ پر نہ تھے۔ قرنِ اول کے سارے ہی اہلِ ایمان تہجد گزار تھے، مگر شب کی خاموشی میں جس کے سینے سے اُمت کے غم میں ہنڈیا کے ابلنے جیسی آواز آتی تھی وہ وہی تھے جنہیں رب العالمین نے خود تسلی دیتے ہوئے فرمایا ''لگتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو آپ جان ہی دے دیں گے''۔ کہاں وہ عظیم انسان اور کہاں ہم جن کے توشۂ عمل میں عمل سے زیادہ سخن سازی، رٹے رٹائے جملوں اور لفظوں کی جگالی۔ پر جوش نعرے، پر کشش سلوگن، سوز اور ساز سے مزین رنگین اور سنگین تقریریں، فصاحت وبلاغت کے دریا، صدراتی اور وزارتی پیغامات اور خطیبانہ مواعظ و ارشادات، ''رسمِ اذاں باقی ہے، روحِ بلالی نہ رہی!''

کہاں وہ جن کے گھر ایک چاند سے دوسرے چاند تک چولہا نہ جلتا تھا، مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحن میں غنیمت کے انبار ہوتے تھے اور شاہِ عرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر وہی فقر اور وہی فاقہ، عین اس وقت جب اسلامی حکومت یمن سے شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ دربارِ اقدس میں حاضر ہوئے، ادھر اُدھر نظر اُٹھا کر کاشانۂ نبوت کا جائزہ لیا، ایک چارپائی جس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرما رہے تھے، سرہانے ایک تکیہ تھا جس میں خرمے کی چھال بھری تھی، ایک طرف تھوڑے سے جَو، ایک کونے میں ایک جانور کی کھال، کھونٹی میں پانی کا مشکیزہ، توشہ خانہ کی حالت دیکھ کر جانِ نثار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ سبب دریافت فرمایا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کیوں نہ روؤں؟ قیصرو

کسریٰ عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہیں اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہو کر بھی اس حالت میں ہیں۔ ارشاد فرمایا اے عمر! کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ قیصر وکسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کے؟ کہاں وہ کہ فقر جن کا سرمایۂ افتخار تھا اور حلال بھی جن کے گھر میں ضرورت سے زائد جمع نہ ہو اور کہاں ہم کہ نہ حلال کی تمیز نہ حرام کی۔ کئی کئی نسلوں کی آسودگی اور عیاشی کا سامان کر رکھا ہے مگر پھر بھی سکون نہیں، جوع البقر کی بیماری نے ہر لیڈر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ایسی بھوک لگی ہے کہ سونے کی اشرفیوں سے مٹتی ہے نہ چاندی کے سکوں سے، نہ ڈالر اور پاؤنڈ اس کا علاج ہیں نہ درہم ودنانیر! ھل من مزید کی صدا بلند کرنے والے پیٹ کا علاج تو وہی ہے جو زبانِ نبوت ﷺ نے بیان فرمایا یعنی قبر کی مٹی، خلقِ خدا تنگ بھی ہے اور شاید آمادۂ جنگ بھی، ایک طرف مہنگائی کا طوفان ہے تو دوسری طرف کرپشن کا عفریت، حالات سے دل برداشتہ والدین ''بچے برائے فروخت'' کا بینر لگا کر سرِ راہ بیٹھ جاتے ہیں یا پھر خودکشی کر لیتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جس کو یہ احساس ہو کہ اگر کوئی بھوکا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تو قیامت کے دن مجھ سے سوال ہو گا۔ کہاں وہ جنہوں نے اپنی کمر سے کپڑا ہٹا کر امتی کو چھڑی دی اور بدلہ لینے کی اجازت عطا فرمائی تاکہ قیامت کے دن کی باز پرس سے بچ سکیں اور اپنے متبنیٰ کے لختِ جگر کی سفارش پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ''کیا تم حدود اللہ میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ سنو! تم سے پہلے لوگ اس لیے گمراہ ہو گئے کہ جب ان کا کوئی معزز اور طاقت ور آدمی چوری کرتا، تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کمزور چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو محمد (ﷺ) اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' کہاں قانون کی یہ پاسداری اور عدل کا نفاذ اور کہاں ہم جو رشوت اور سفارش کے کلچر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، قانون مکڑی کا جالا ہے، جو کمزور کو پھانس لیتا ہے اور جسے طاقت ور مجرم توڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ بھوک کے ہاتھوں ستایا ہو یتیم بچہ چند کلو آٹا

> **کہاں وہ جنہوں نے مسلمان کے خون کی حرمت یومِ عرفہ، بلدِ حرام، اور ماہِ ذی الحجہ کے مساوی بیان فرمائی اور جب غلط فہمی کی بنیاد پر حضرت اسامہؓ کے ہاتھوں چند لمحوں کا مسلمان شہید ہو گیا تو آپ ﷺ تڑپ اٹھے تھے، آسمان کی طرف مبارک چہرہ اور ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ''اے اللہ انہوں نے جو کچھ کیا، میں اس سے بری ہوں''**

چوری کرنے پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا ہے جب کہ ملکی خزانے سے کروڑوں اربوں چوری کرنے والے نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ معززین میں شمار ہوتے ہیں۔ کہاں وہ جن کا وجود سراپا خیر اور رحمت ہے اور جن کی زبان اور ہاتھ سے دشمن کو بھی تکلیف نہ پہنچی اور کہاں ہم جن کے شر سے نہ اپنے محفوظ ہیں، نہ بیگانے، نہ گھر محفوظ ہیں، نہ سیاست وتجارت۔ سانپ اور بچھو بھی شاید کسی کو معاف کر دیتے ہوں، مگر وہ کسی کو معاف نہیں کرتے، ڈنگ مارنا اور ڈسنا ہی ان کا مقصدِ حیات بن کر رہ گیا ہے۔ کہاں وہ جو کافر کی بیٹی کی حرمت بھی برداشت نہ کر سکتے تھے، رضاعی بہن دشمن قبیلے کے قیدیوں کے ساتھ گرفتار ہو کر آئیں تو اپنی چادر مبارک بچھا کر اس پر بٹھایا اور انہیں اختیار دیا کہ چاہو تو عزت ووقار کے ساتھ میرے پاس رہو اور اگر چاہو تو میں تحائف اور سامان کے ساتھ تمہیں رخصت کر دوں اور تم اپنے قبیلے میں پہنچ جاؤ، انہوں نے دوسری صورت پسند فرمائی چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں گرانقدر تحائف کے ساتھ رخصت فرما دیا، کہاں بہن اور بیٹی کی یہ عزت افزائی اور کہاں ہماری ذلت کہ اپنی بہن بیٹی چند ڈالروں کے عوض ننگِ انسانیت دشمنوں کے حوالے کر دی، کہاں وہ جنہوں نے بدر واحد اور خندق کے سرغنہ ابوسفیانؓ، محبوب چچا اور اسلام کے ہیروؓ کو شہید کرنے والے غلام وحشیؓ اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبانے والی ہندہؓ اور اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کو اقتدار واختیار کے ہوتے ہوئے معاف کر دیا تھا اور کہاں ہم جو مسجد اور مدرسے میں محصور چند پُرجوش نوجوانوں اور معصوم طلباء اور طالبات کو معاف نہ کر سکے۔ کہاں وہ جو اپنے دعوت وتبلیغ پر مادی اجرت کے طلب گار نہ تھے، بار بار فرماتے تھے ''میں تم سے کسی قسم کی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو بس رب العالمین کے ذمے ہے''۔ اور کہاں ہم کہ جن کے جوتیوں کے صدقے ہمیں عزت بھی ملتی ہے اور روٹی بھی، خود ان کی شان بیان نہیں کرتے جب تک منہ مانگا معاوضہ نہ مل جائے۔ کہاں وہ جن کی بلندیٔ اخلاق کی شہادت خالق نے بھی دی اور مخلوق نے بھی، حتیٰ کہ ابولہب

بقیہ صفحہ (51) پر

اسلام کا آفاقی نظام

حبیب الرحمن اعظمی

ان میں کوتاہی کرنے والوں کو اسلام اپنی پسندیدہ اولاد نہیں مانتا اس کی نظر میں ایسے لوگ سپوت نہیں بلکہ کپوت ہیں۔
لیکن عزت وناموس کو معرض خطر میں ڈال کر کون باغیرت ہوش مند روپے پیسوں کو ترجیح دینے کی جسارت کرے گا؟

اسلام ایک آسمانی دین ہے اس کے قوانین واحکام رب ہر دوعالم کی تنزیل اوراس کے نبیٔ مرسل ﷺ کی تبیین وتشریح کے مطابق وضع کئے گئے ہیں، جو اس قدر ہمہ گیرو ہمہ جہت ہیں کہ رہتی دنیا تک ان میں کسی ترمیم واضافہ کی حقیقی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور کائنات انسانی کی اس ہدایت ورہنمائی میں دارین کی صلاح وفلاح کی منزلیں طے کرتی رہے گی، خالق ہر دوسرا نے خود اسلام کی کاملیت پر مہر تصدیق ثبت فرمادی ہے۔

”اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا“۔ (آلِ عمران)

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی، اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا۔

پھر کتاب الٰہی اور سنتِ رسول (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے ماہرین فقہائے مجتہدین نے اپنی جاں گسل جہد مسلسل سے ان خدائی قوانین واصول کو تغیر پذیر دنیا کے مسائل و معاملات پر منطبق کرنے کے لئے ایسے مناہج اور شاہراہیں مقرر کردیں جن پر چل کر علمائے اسلام اورمفتیان دین نت نئے مسائل و مشکلات کا شرعی حل پیش کرتے رہیں گے۔

اسلام کے احکام وہدایات کی آفاقیت اور ہمہ جہتی کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ صرف اس فنا ہوجانے والی زندگی ہی کے بارے میں رہنمائی نہیں کرتا بلکہ اس جہانِ بے ثبات سے رخصت ہوجانے کے بعد آخرت کی ابدی حیات کے متعلق بھی ہدایات واحکام دیتا ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں اور صحیح جانتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات ہماری زندگی کے جملہ شعبوں اور تمام گوشوں پر حاوی ومحیط ہونے کے ساتھ صحتمند انسانی فطرت اورنیچر (Nature) کے عین مطابق ہیں، اسلامی تعلیمات واحکام کا یہ ایسا امتیاز اور منفردانہ مقام ہے کہ مذاہب وملت اور تہذیب وتمدن کی وسیع دنیا میں کسی بھی ملت وتہذیب کو اس کی ہمسری نصیب نہیں۔ ”جسے چاہے مالکِ رنگ و بو اسے نکہتوں سے نوازدے“

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر اک کا یہ نصیب یہ بختِ رسا کہاں

ذیل میں اسلام کے آفاقی نظام کا اجمالی اور نہایت اجمالی خاکہ ملاحظہ کیجئے:

۱- عقاید: دینِ اسلام کا بنیادی واساسی پتھر، جس پر اس کی عمارت قائم ہے، الوہیت، رسالت، آخرت، تقدیر وغیرہ سے متعلق اس کا نظریۂ عقیدہ ہے اسلام انھیں افراد کو اپنا حلقہ بگوش اور فرزند تسلیم

کرتا ہے جو اس کی تصریحات اور وضاحتوں کے مطابق مذکورہ بالا حقائق کو دل کی گہرائیوں سے مانتے اور بوقت طلب ان کا اقرار واعتراف کرتے ہیں۔اسلام کا یہ نظریہ عقاید متواترات وقطعیات کی مستحکم غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہے جس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور خفا و پوشیدگی نہیں ہے؛ بلکہ نہایت واضح، شفاف، ہموار و استوار شاہراہ ہے، جس پر انسان اپنے ابتدائے وجود سے چلتا آرہا ہے۔

۲-عبادات: اسلام کا اپنا ایک نظام عبادت ہے، جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں پنج وقتہ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کو رکن یعنی ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام کے نزدیک ان چاروں عبادتوں کی فرضیت کا قائل ہونا بھی اس کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے ابدی اور ضروری ہے۔ہر بالغ مسلمان مرد وعورت پر ان چاروں کی ادائیگی اپنی استطاعت و قدرت کے مطابق فرض اور ضروری ہے، ان میں کوتاہی کرنے والوں کو اسلام اپنی پسندیدہ اولاد نہیں مانتا اس کی نظر میں ایسے لوگ سپوت نہیں بلکہ کپوت ہیں۔

۳- معاملات: اسلامی تعلیمات کے اس باب کا بھی حدود اربعہ نہایت وسیع ہے جو انسانی زندگی میں پیش آنے والے جملہ معاملات کو گھیرے ہوئے ہے "تجارت، ملازمت، کرایہ داری، حرفت وصنعت، نکاح وطلاق" وغیرہ، اقتصادیات ومعاشیات سے متعلق جملہ امور مسائل بھی اسی باب کے تحت ہیں۔ علمائے اسلام نے اس باب پر خصوصی توجہ دی ہے اور ان سے متعلق مسائل کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسلام کے اقتصادی نظام کا دیگر نظاموں سے مقابلہ اور موازنہ کرکے واضح کیا ہے۔ اب تک اسلام جیسا متوازن ومعتدل اور پورے انسانوں کے لئے یکساں مفید ونفع بخش اقتصادی نظام پیش نہیں کیا جاسکا ہے۔

۴- نظام مملکت: اسلام کا یہ نظام بھی اپنے اندر بڑی وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے۔ اس نظام کی کلیدی شرط یہ ہے کہ حکومت ومملکت کا قیام اربابِ حل وعقد اور عوام کی باہمی رضامندی پر استوار ہونا چاہئے، محض قوت و طاقت کی بنیاد پر انسان کی جماعت پر تسلط انسانی حرمت وشرافت کے منافی ہے۔ پھر حکومت کے جملہ معاملات میں اصل حکمرانی عدل اور قانونِ (خداوندی) وانصاف کی ہونی چاہئے افراد واشخاص کی شخصی رائے اور خواہشات کی نہیں۔اسی نظام کے تحت فرد کا جماعت سے تعلق نیز مسلم حکومت کا دیگر اہل مذاہب اور مملکتوں سے تعلق پر بھی اسلام اپنی منصفانہ ہدایات دیتا ہے۔اس موضوع پر فقہائے اسلام نے کتاب وسنت کی روشنی میں مکمل بحث کی ہے، جنھیں ان کی تصانیف میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۵- نظام معاشرت: یہ بھی اسلام کا ایک وسیع نظام ہے۔فرد کا فرد کے ساتھ رشتہ، فرد کا جماعت، سماج، ملک کے ساتھ رشتہ، نیز والدین کے حقوق اور ذمہ داریاں، زوجین کے حقوق اور باہمی ذمہ داریاں، اولاد کے حقوق اور فرائض نیز اہل رشتہ اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق وفرائض کے بارے میں اسلام کی اپنی ہدایات وتعلیمات ہیں، جن کا مقصد اصلی ایک صالح، انسانیت نواز اور ہر سلیم الفطرت کے لئے قابل قبول معاشرہ اور سماج کا وجود وقیام ہے۔اسلام کی نظر میں اس معاشرہ کے برپا کرنے میں جو امور مخل اور سدّ راہ بنتے ہیں، وہ ان پر قدغن لگاتا ہے اور پابندیاں عائد کرتا ہے، حجاب نساء اور پردۂ نسواں کا تعلق دراصل اسی سد ذرائع سے ہے۔ عورت کی بے حرمتی یا سماج میں اسے الگ تھلگ کردینے سے قطعی طور پر اس کا تعلق نہیں۔ وہ لوگ جو عورت کی ترقی اور زندگی کے میدان میں اسے بلند مقام پر پہنچانے کے نام پر اسے گھر سے نکال کر کاروباری دفتروں میں پہنچادینے کے جتن میں مصروف ہیں اور اپنی رائے وعمل کے خلاف کسی بات کو سنجیدگی سے سننے کے لئے تیار نہیں ہیں وہ کم از کم آج سے پچاس سال پہلے ہندوستانی سماج کا جائزہ لیں، جبکہ بلالحاظِ مذہب وقوم، عورتیں بے لباسی کے مقابلہ میں، لباس اور بے حجابی کے مقابلہ میں، حجاب کو پسند کرتی تھیں اور یہ عام دستور تھا کہ عورتیں جب کسی کام سے گھر سے باہر نکلتی تھیں تو ان کا پورا جسم لباس سے مستور ہوتا تھا حتی کہ چہرے کو چھپانے کے لئے لمبا گھونگھٹ نکال لیا کرتی تھیں، اور انصاف سے بتائیں کہ آج سے پچاس برس پہلے کی ان باحیا پردہ دار عورتوں کی جان اور عزت وناموس زیادہ محفوظ تھی، یا سڑکوں پارکوں اور دفتروں میں نمائشِ بدن کرنے والی آج کی ماڈرن عورتوں کی جان اور عزت وناموس زیادہ محفوظ ہے؟ ہاں اس میں کوئی تردد نہیں کہ کمپنیوں، سرکاری دفتروں اور اسٹوروں میں آج کی اہل کار عورتوں کے پاس ان پردہ نشین عورتوں کی بنسبت مال ودولت زیادہ ہے لیکن عزت وناموس کو معرض خطر میں ڈال کر کون باغیرت ہوش مند روپے پیسوں کو ترجیح دینے کی جسارت کرے گا؟

بہرحال اسلام کے دائرۂ احکام کی یہ ایک اجمالی اور نہایت اجمالی فہرست ہے جس سے کسی حد تک اس

کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔علمائے اسلام اور مفتیان دین شرعی طور پر اس کے مکلف ہیں اور ان کا یہ علمی فریضہ ہے کہ اسلام کے ان احکام وتعلیمات کے بارے میں اگر کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے تو زبان وقلم سے حسب موقع اسے مطلوبہ معلومات بہم پہنچائیں۔ رہا مسئلہ اسلام کے نظریات اوراحکامات وتعلیمات پر علمی ونظری بحث وتحقیق کا تو علم وفکر کے تقاضے اورآداب کی حدود میں رہتے ہوئے گفتگو کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

آج کے دور میں جبکہ آزادیٔ تقریر وتحریر، آزادیٔ رائے ومذہب وغیرہ کو ہر فرد بشر کا بنیادی حق گردانا جارہا ہے تو کیا یہ حق صرف مغرب گزیدہ میڈیا اور لینن واسٹالن کے پرستاروں کو ہی حاصل ہے؟ یا پابندِ دین مسلمان اور علمائے دین کو بھی یہ حق حاصل ہے؟ اور بلاشبہ انھیں یہ حق حاصل ہے اور وہ اپنے اس حق کا استعمال کرتے رہیں گے۔

مسلمانوں کے مسائل پر ارون شوری کے دماغ سے سوچنے اور ٹھاکرے کی زبان بولنے والے میڈیا سے متعلق بعض عناصر اور کچھ مسلم نما اسلام سے بے خبر افراد اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے شور وغوغا مچانے سے اسلام کے یہ باوفا اپنے اس حق کے استعمال اور اپنے دینی فریضہ کی انجام دہی سے باز آجائیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے، یہ لوگ اپنی عادت کے مطابق غبار اڑاتے رہیں گے۔مگر یہ کاروانِ علم و دین اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہے گا۔

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ہوا چل رہی ہے



مولانا روح اللہ نقشبندی

محرم الحرام

فضائل و احکام کے آئینہ میں

نسبت سے بھی کسی شے میں تعظیم آجاتی ہے، لیکن یہ اسی وقت ہے جب کہ وہ نسبت سچی اور واقعی ہو۔ ماہ محرم کی فضیلت کی وجہ سے جس طرح اس میں عبادات کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ اس ماہ کے اندر گناہوں اور معصیت میں ملوث ہونے کے وبال و عتاب کے بڑھ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے :۔ ''صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فاکملوا ثلثین یوماً'' چاند دیکھ کر رمضان شروع کرلو اور چاند دیکھ کر رمضان ختم کرلو اور اگر کبھی کوئی مغالطہ لگ جائے تو مہینے کے تیس ر ۳۰ دن پورا کرلو۔ مگر سالوں کا حساب اس سے مختلف تھا ان کے شمار کے لیے لوگ کبھی کسی بڑے واقعہ کو ابتداء قرار دے لیتے اور کبھی کوئی زلزلہ، سیلاب یا جنگ اصل قرار پا جاتا۔

جیسے رسول اللہ ﷺ نے اسلامی تاریخ کا آغاز اسلام کے بہت اہم اور مہتم بالشان واقعہ ''ہجرت'' سے فرمایا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سنہ ہجری کی ابتداء حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ہوئی لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ آپؓ نے سرکاری مراسلات میں تاریخ کا اندراج لازمی قرار دیا تھا۔ ورنہ اس کی اصل تو خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے حکم ہی سے ہو چکی تھی۔ (تاریخ ابن عساکر)۔

مسلمانوں نے قمری سال ہی کیوں اختیار کیا؟

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں ہے :۔ ''هُوَالَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّـنِيْنَ وَالْحِسَابَ''۔ اللہ وہ ہے جس نے سورج کو ضیاء اور چاند کو نور بنایا اور ان میں سے ہر ایک کے لیے منزلیں مقرر فرمادیں تاکہ تم سالوں کا حساب و شمار معلوم کرسکو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔ ''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ''۔ بے شک مہینوں کی تعداد اللہ تعالی کے نزدیک لوح محفوظ میں ۱۲ ہی مقرر ہے۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت سے ثابت ہوا کہ مہینوں کی جو ترتیب اور ان مہینوں کے جو نام اسلام میں معروف ہیں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی اصطلاح نہیں بلکہ اللہ رب العالمین نے جس دن آسمان و زمین پیدا کیے، اسی دن یہ ترتیب اور نام اور ان کے ساتھ خاص خاص مہینوں کے خاص خاص احکام متعین فرما دیے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے نزدیک احکام شرعیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہے۔ اسی قمری حساب پر تمام احکام شرعیہ روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ دائر ہیں۔ قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے۔ اگر ساری امت قمری حساب کو بھلادے تو سب مسلمان گنہگار ہوں گے۔ (معارف القرآن)۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شمسی حساب ناجائز یا حرام ہے، بلکہ ہر شخص کو

اختیار ہے کہ وہ اپنے کاروبار، تجارت وغیرہ میں چاہے قمری حساب استعمال کرے اور چاہے شمسی حساب۔مگر نماز، روزہ، حج، زکوۃ، عدت وغیرہ میں بہرصورت اس کو قمری حساب ہی شریعت کے مطابق رکھنا ہوگا۔ کیونکہ اس میں شبہ نہیں کہ سنتِ انبیاء علیہم السلام اور سنت محمد رسوا للہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں قمری حساب ہی استعمال کیا گیا ہے ان کا اتباع بہرحال موجب برکت اور ثواب ہے۔

''محرم'' اسلامی سال کا پہلا قمری مہینہ ہے۔ اس میں م مضموم ح مفتوح اور ر مشدد پڑھی جاتی ہے۔ علاوہ ازایں یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔اس کے لغوی معنی معزز اور محترم کے ہیں۔قرآن مجید میں بیت اللہ شریف کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک دعا کے ضمن میں آیا ہے:۔

''رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ'' (سورة ابراہیم، ۳۷۔)

''اے اللہ! میں نے اپنی اولاد بے آب وگیاہ بستی میں تیرے گھر کے پاس بسائی ہے''

تشریح: محترم گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے، یہ اگرچہ اس وقت منہدم حالت میں تھا، تاہم اس کی جگہ خوب جانی پہچانی اور سب کی نگاہوں میں محترم اور متبرک تھی۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ'' (سورہ توبہ ۳۶)۔

بے شک مہینوں کی تعداد تو اللہ کے نزدیک بارہ/۱۲ ہی ہے۔ اسی دن سے جب سے اس نے زمین وآسمان بنائے۔ان میں سے چار مہینے خصوصاً عظمت والے ہیں، پس ظلم نہ کرو اپنی جانوں پر ان مہینوں میں۔

تشریح: ان عظمت والے چار مہینوں میں بالاتفاق پہلا مہینہ ''محرم الحرام'' کا مہینہ ہے۔ باقی تین مہینے رجب، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے مہینے ہیں۔

عرب لوگ زمانۂ جاہلیت میں بھی ان مہینوں کی تعظیم کرتے تھے اور ان میں قتال حرام جانتے تھے۔

اسلام میں ان مہینوں کی عظمت وحرمت اور زیادہ ہوگئی۔ ''فلا تظلموا فیھنّ انفسکم'' ان مہینوں میں طاعت مقبول تر اور معصیت قبیح تر قرار دی گئی ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے:۔ ''انّ المعصیة فیھا اشدّ عقاباً والطاعة فیھا اکثر ثواباً۔ لا یبعدٌ ان یعلم اللہ تعالی ان وقوع الطاعة فی ھذہ الاوقات اکثر تاثیراً فی طھارة النفس ووقوع المعاصی فیھا اقوی تاثیراً فی خبث النفس وھذا غیر مستبعد عند الحکماء''۔

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ متبرک اوقات میں معصیت کی برائی شدید تر ہوتی ہے اور اسی پر متبرک مقامات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔تو وائے برحال ان لوگوں کے جو اولیاء صالحین کے مزارات پر اور وہ بھی زمانۂ عرس میں فجور وبدعات کا ارتکاب کیا کرتے ہیں۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں ماہ محرم الحرام کو تشریفاً شہر اللہ کہا گیا ہے جیسے دوسرے مقامات پر کعبہ شریف کو بیت اللہ اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقة اللہ فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ محرم الحرام کی اسی بزرگی اور برتری کی بناء پر حضور سرور کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:۔ ''افضل الصیام بعد رمضان شھر اللہ المحرم'' رمضان کے بعد سب مہینوں سے زیادہ افضل محرم الحرام کے روزے ہیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا:۔ ''من صام یوماً من المحرم فلہ بکلّ یوم ثلاثون یوما''۔ (غنیة الطالبین)۔

یعنی ایام محرم میں سے ایک یوم کا روزہ دوسرے مہینوں کے تیس ایام کے برابر ہے۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے اس کی بہت سی وجوہ نقل فرمائی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ جملہ کائنات ومافیہا سب اسی ماہِ محرم میں شرفِ وجود سے مشرف ہوئیں نیز کائنات کے دوسرے اہم اور مہتم بالشان کام حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے تک سب اسی مبارک اور محترم مہینہ میں سرانجام پائے۔ بلکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ قیامت بھی اسی مہینہ میں واقع ہوگی۔(غنیۃ الطالبین)۔

بناء بریں ہم اس مہینہ کو کائنات کا مبداء اور منتہاء قرار دے سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً انہیں خصوصیات کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہینہ کے خاص الخاص دن یعنی یوم عاشورہ کا روزہ رکھا اور آئندہ سال دوروزے رکھنے کا وعدہ فرمایا۔بعض روایات میں آتا ہے کہ رمضان المبارک کی فرضیت سے پہلے یہی عاشورہ کا روزہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر فرض تھا مگر چونکہ اس کا اہتمام زیادہ تر یہود اور نصاریٰ کیا کرتے تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آئندہ سال ایک روزہ کے اضافے کا فیصلہ فرمایا تاکہ یہود سے تشبہ بھی لازم نہ آئے اور اکتسابِ ثواب میں بھی کوئی کمی نہ ہو۔ چنانچہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:۔ ''صوموا عاشوراء وخالفوا فیہ الیہود وصوموا قبلہ یوماً او بعدہٗ یوماً'' (احمد)

عاشورہ کا روزہ رکھو تو ضرور رکھو مگر یہود سے امتیاز کے لیے آگے یا پیچھے ایک دن کا اضافہ کرلو۔
مسلم شریف کی ایک روایت میں آتا ہے
"اَحتسب علی اللہ ان یکفر السنۃ التی قبلہ"
یعنی مجھے غالب توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے گزشتہ ایک برس کے گناہ معاف فرمادیں گے۔

احادیث پاک کی رو سے فضائل محرم وعاشورہ کا بیان

(۱) امّ المؤمنین امّی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ یوم عاشورہ یعنی دسویں محرم کا روزہ ہے۔(مشکوۃ شریف)

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ سب سے زیادہ اہتمام نفلی روزوں میں عاشورہ کے روزہ کا فرمایا کرتے تھے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ۱۰ھ ہجری میں آپ ﷺ نے روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ آئندہ سال میں اس دن کو پاؤں گا تو نویں محرم ودسویں یا دسویں وگیارھویں محرم کا روزہ رکھوں گا تا کہ یہودیوں کے روزے اور ہمارے روزوں میں امتیاز ہوسکے۔

(۴) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا عرفہ کا نفلی روزہ روزہ دارے کے لیے دوسال کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے جس سال میں اس نے روزہ رکھا اور اس سے پہلے سال کا کفارہ ہوتا ہے، لیکن عاشورہ کا روزہ صرف ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

"صوم یوم عرفة ان یکفر السنة والسنةالتی بعده وصیام یوم عاشوراء احتسب علی الله ان یکفر السنة التی قبله" (مسلم شریف)

نوٹ:۔ اس حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں روزے ہیں تو نفلی ان میں کوئی بھی واجب یا فرض نہیں ہے لیکن عرفہ کے روزے کو عاشورہ کے روزہ پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ عاشورہ کا روزہ شریعت میں مشروع نہیں ہے اس روزہ کو آپ نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں کو رکھتے ہوئے دیکھا اور دریافت فرمایا تو یہودیوں نے جواباً عرض کیا کہ اس دن ہمارے نبی موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تھی ۔ اور اسی دن بفضل خدا انہوں نے دریائے نیل کو عبور کیا تھا ہم اس شکریئے میں یہ روزہ رکھتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا "نحن احق باخی لنا موسیٰ" ہم اپنے بھائی موسیٰؑ کی موافقت میں اس روزہ کے رکھنے کے زیادہ حقدار ہیں ۔ چنانچہ نبی ﷺ نے عاشورہ کا روزہ حضرت موسیٰؑ کی متابعت میں نہیں بلکہ ان کی موافقت میں رکھا تھا۔

(۵) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا جو امتی عاشورہ کے دن اپنے اہل وعیال پر رزق میں فراخی کرے گا تو اللہ تعالیٰ پورے سال اس کے رزق میں فراوانی عطا فرمائے گا۔(مشکوۃ شریف)

حضرت سفیانؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کیا تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ پورے سال ہمارے رزق میں فراوانی رہی۔ جذبہ اتباع امرِ نبی ﷺ کی واقعی یہی برکات وثمرات ہیں۔ مسلمانوں کو اس حدیث پاک پر عمل کرکے برکات سے مستفید ہونا چاہیے۔

محرم کی دسویں تاریخ کو عاشورہ کیوں کہتے ہیں؟
علماء لغت نے جو توجیہ کی ہے اسے آپ پیش نظر رکھیں ۔ پہلی توجیہ گنتی کے لحاظ سے جب ہم عربی میں ایک سے دس تک گنتی گنیں تو اس طرح ہے۔
واحد، اثنان، ثلٰث، اربع خمس، ست، سبع، ثمانیہ، تسعہ،عشرہ۔
ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس۔
"عاشورہ" دسواں دن ۔ محرم کے دسویں دن کو اسی مناسبت سے عاشورہ کہتے ہیں ۔ (۲) وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دن انبیاء کرام کو اللہ ربّ العزت نے دس انعامات سے نوازا ہے اس لیے اس کو عاشورہ کہا جاتا ہے جس کی تفصیل اس طریقہ پر ہے۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام نے جب بھول کر درخت ممنوعہ کا پھل کھایا پھر فوراً ہی اپنی لغزش پر نادم ہوکر بارگاہ خداوندی میں ان الفاظ کے ساتھ توبہ کی:۔ اے پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اگر آپ کی بارگاہ قدس سے ہمیں معافی نہ ملی اور ہم پر آپ نے رحم نہیں فرمایا تو یقیناً ہم گھاٹے میں رہ جائیں گے۔(سورہ اعراف)
چنانچہ قرآن پاک میں ہے "فتاب علیه" یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی توبہ قبول فرمائی یہ دن عاشورہ کا تھا۔

(۲) حضرت ادریسؑ کو رفعتِ مکانی کی نعمت اسی دن حاصل ہوئی جیسا کہ سورہ مریم میں ہے ۔ "ورفعناہ مکاناً علیا"۔ (ترجمہ) ہم نے انہیں قرب وعرفان کے بہت اونچے مقام پر پہنچایا۔
بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح حضرت ادریسؑ بھی آسمان پر اٹھائے گئے۔

(۳) قوم نوحؑ نے جب حضرت نوحؑ کی تکذیب کی

اوراس کی پاداش میں جب انہیں طوفان میں غرق کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو عاشورہ کے دن انعام خاص سے نوازا اور فرمایا:۔ اے نوح اب تم مع اپنے متبعین کے جو تمہارے ساتھ اس کشتی میں ہے ہماری بخشی ہوئی سلامتی کے ساتھ زمین پر اتر جاؤ اور ہمارے عطا کردہ برکتوں سے بھی مستفید ہوتے رہو انہی برکات میں سے حضرت نوحؑ کا آدم ثانی ہونا بھی ہے کیونکہ عام غرقابی کے بعد دوبارہ نسل انسانی حضرت نوحؑ سے پھیلی ہے۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ ۱۰ محرم کو پیدا ہوئے اسی روز انہیں نبوت عطا فرمائی گئی اور خلیل اللہ کا لقب عطا کیا گیا۔ یہی دن تھا جب آپ نے نمرود کے شاہی مندر میں جا کر تمام بتوں کو توڑا اور اس کی سزا میں آپ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا یہ سورۃ الانبیاء میں مذکور ہے اللہ رب العزت نے فرمایا:۔

"یانار کونی برداوّ سلاماعلی ابراہیم"

ترجمہ:۔ اے آگ تو ٹھنڈی ہوجا اور ہمارے خلیل ابراہیمؑ کے لیے سلامتی بن جا۔

(۵) مشہور روایت ہے کہ حضرت داؤدؑ کی توبہ اسی دن قبول ہوئی جس کا ذکر سورہ ص میں ہے:۔

اور داؤد علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ ہم نے ان کی آزمائش کی ہے تو انہوں نے اپنے رب کے حضور میں مغفرت کی درخواست کی تو ہم نے انہیں بھی معاف کردیا اور توبہ کی قبولیت سے نوازا۔

(۶) حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں سے ملک نکل گیا تو عاشورہ کے روز رب کے حضور میں ان الفاظ سے دعا کی:۔ اے میرے پروردگار مجھے ایسا ملک (غلبہ) عطا فرما کہ میرے بعد کسی کے لیے ایسا ملک نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ انہیں حکمرانی عطا فرمائی۔

(۷) مشہور ہے کہ حضرت ایوبؑ کے جسم اطہر پر آبلے پڑ گئے لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور خدائے قدوس کے حضور دعا کی:۔

"رب انی مسّنی الضر وانت ارحم الراحمین"

اے میرے رب مجھے تکلیف ومرض نے گھیر لیا ہے اور آپ ہی ارحم الراحمین ہیں۔ چنانچہ اسی دن یعنی دس محرم کو ان کی دعا قبول ہوئی اور فرمایا ہم نے حضرت ایوبؑ کی دعا قبول کی اور ان کی تکالیف کو دور کردیا۔

(۸) عاشورہ کے دن حضرت موسیٰؑ نے دریائے نیل کو پار کیا اور فرعون مع اپنے لشکر کے غرق کیا گیا۔

(۹) ۱۰ محرم ہی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو اپنی رحمت بے پایاں سے نواز کر انہیں مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالا اور فرمایا:۔ "فنبذناہ با لعراء وھو سقیم"۔ (الصّٰفّٰت) ہم نے حضرت یونسؑ کو کنارے پر لا ڈالا اس حال میں کہ وہ بیمار تھے۔

(۱۰) جب حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں نے سولی پر چڑھانے کا ارادہ کیا تو جیسا وعدہ فرمایا تھا:۔ اے عیسیٰ میں تجھے آسمان پر اٹھالوں گا اور کافروں کے حربے سے پاک رکھوں گا۔ (سورہ مریم)

پھر جیسا کہ سورہ مائدہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو ان کے رب نے آسمان پر اٹھالیا اور سولی پر چڑھائے جانے والے شخص کے بارے میں وہ (یہودی) شک شبہ میں ڈال دیئے گئے۔ یہ انعام حضرت عیسیٰؑ پر عاشورہ کے دن ہوا۔

یہ اجمالی تذکرہ تھا ان انعاماتِ خاص کا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں (انبیاء ورسل علیہم السلام) پر اس روز فرمائے جو عاشورہ کا دن کہلاتا ہے۔

سانحہ کربلا!

یوم عاشورہ یعنی دس محرم کے دن ہی سانحہ کربلا بھی واقع ہوا، جس میں حضرت حسین ابن علیؓ کو میدانِ کربلا میں شہید کردیا گیا، طوالتِ کلام کے سبب ہمیں اس کے اسباب وعلل پر گفتگو کرنا اس لیے مناسب نہیں کہ یہ ایک موضوع ہی علیحدہ ہے اس پر طویل گفتگو کی جائے تو ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

حقیقت محرم!

محرم باب تفعیل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، عربی میں تحریم کے دوسرے معانی کے ساتھ اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ تو محرم کے معنی معظم (عظمت والا) ہوئے۔ چونکہ یہ مہینہ عظمت کے قابل ہے اس لیے اس کا نام محرم ہے، زمانۂ اسلام سے قبل بھی محرم الحرام ان چار مہینوں میں شمار ہوتا تھا جن میں مشرکین عرب جنگ وجدال اور قتل وقتال کو بند رکھتے تھے اور ابتداء میں اسلام نے بھی اس کے اندر قتال کے ممنوع ہونے کو باقی رکھا، مگر باتفاق امت حرمت قتال کا یہ حکم آیت قرآنیہ "فاقتلو ا لمشر کین حیث وجد تموھم" (پارہ ۱۰) سے منسوخ ہوگیا اور اب ان مہینوں میں قتال جائز ہے۔ اگرچہ اب بھی افضل یہی ہے کہ ان مہینوں میں قتال کی ابتداء نہ کی جائے۔ (شامی ص ۳۰۲، ج، ۳)

پورا مہینہ حق تعالیٰ کی خصوصی توجہات کا محل ہے، اس مہینے میں جتنا ہوسکے عبادات میں کوشش کرنی چاہیے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مہینے کو اس لیے فضیلت ملی کہ حضرت حسینؓ کی شہادت اس میں ہوئی اور شیعہ لوگ اسی لیے اس کو منحوس سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے اس ماہ میں وہ کوئی تقریب اور خوشی کا کام نہیں کرتے۔ اس کے برعکس مسلمانوں

کے یہاں یہ مہینہ محترم و معظم اور فضیلت والا ہے لہذا اس میں نیک کام بہت کرنے چاہئیں۔

محرم کا روزہ

اس ماہ کو یہ بھی عزت حاصل ہے کہ اس کے اندر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی معیت میں فرعون کے ظالم و جابر ہاتھوں سے نجات پائی اور فرعون مع اپنے ساتھیوں کے دریائے نیل میں غرق ہوا اس لیے بطور شکریہ کے حضرت موسیٰؑ نے اس مہینے کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھا تھا۔حضور ﷺ نے (یہودیوں کو) فرمایا کہ پھر ہم اس کے تم سے زیادہ حق دار اور موسیٰؑ کے زیادہ قریب ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس دن کا روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم فرمایا۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس دن کا روزہ رکھنا رمضان کے بعد تمام روزوں سے افضل ہے۔(بخاری و مسلم شریف،)

اس لیے اس کے ساتھ ایک دن کا روزہ اور ملا لینا چاہیے، بہتر یہ ہے نویں دسویں کا روزہ رکھا جائے، اگر کسی وجہ سے نویں کا نہ رکھ سکے تو پھر دسویں کے ساتھ گیارہویں کا روزہ رکھنا چاہیے صرف دسویں محرم کا روزہ رکھنا کراہت سے خالی نہیں۔

دسویں محرم کا دن اہل و عیال کے ساتھ!

شریعت مطہرہ نے اس دن کے لیے یہ تعلیم بھی فرمائی ہے کہ اپنے اہل و عیال پر کھانے پینے میں فراخی اور وسعت کی جائے تاکہ اس پر تمام سال فراخی رزق کے دروازے کھول دیئے جائیں،حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔"من وسع علیٰ عیالہ فی النفقۃ یوم عاشوراء وسع اللہ علیہ سائر سنتہ" (مشکوۃ ص،۱۷۰،)

اس ماہ کی برکت وعظمت اور فضائل کا تقاضہ یہ ہے کہ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ عبادات میں مشغول ہوکر تجلیات رحمانی کا بڑا حصہ حاصل کیا جائے۔مگر ہم نے محرم الحرام کے مہینے اور خاص طور پر اس کی دسویں تاریخ کو طرح طرح کی خود تراشیدہ رسومات و بدعات کا اپنے آپ کو پابند کرکے بجائے ثواب حاصل کرنے کے الٹا معصیت اور گناہ میں مبتلا ہوکر ہلاکت کا سامان فراہم کرلیا۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ماہ محرم کی فضیلت کی وجہ سے جس طرح اس میں عبادات کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اسی طرح اس ماہ کے اندر گناہوں اور معصیت میں ملوث ہونے کے وبال وعتاب کے بڑھ جانے کا بھی اندیشہ ہے، اس ماہ میں جن امور کی ہدایات پیغمبر ﷺ نے کی ہیں وہ دو ہیں ۔ ایک نویں دسویں، یا دسویں گیارہویں کا روزہ جو کہ سنت ہے، دوسرے دسویں کو حسب استطاعت اہل و عیال پر کھانے پینے میں وسعت وفراخی کرنا جو کہ مستحب ہے۔ان کے علاوہ جن بدعات ورسومات کا رواج ہمارے زمانے میں ہورہا ہے وہ سب قابل ترک ہیں۔ان میں سے بعض مروجہ بدعات ورسومات کا تذکرہ اس جگہ بھی کیا جاتا ہے۔

یوم عاشورہ کی چھٹی!

دیکھا جاتا ہے کہ لوگ عام طور پر اس دن چھٹی کردیتے ہیں، حالانکہ یہ کئی وجوہ سے غلط ہے، ایک یہ کہ شیعوں کے ساتھ مشابہت ہے اور ان کے عزائم وارادوں کو بڑھاوا دینا ہے اور ان منکرات کی تائید وتقویت ہے۔دوسرے یہ کہ شیعہ اس دن ماتم کرتے ہیں سخت مصیبت ومشقت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہیں مسلمان چھٹی کرکے ان کے تماش گیر بنتے ہیں جبکہ منکرات کو دیکھنا بھی غلط ہے۔

تعزیہ کی بدعت!

تعزیہ بنانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور اس کا بنانا رسومات میں داخل ہونے کی وجہ سے سخت گناہ ہے، مال اچھی اور جائز کمائی سے ہونی چاہیے اور خرچ بھی صحیح مصرف میں ہونا چاہیے اور بعض عوام جہلاء تو تعزیہ کے سامنے نذر و نیاز کرتے ہیں جس کا کھانا "وما اھلّ بہ لغیر اللہ" میں داخل ہوکر حرام ہے۔ اسکے آگے دست بستہ تعظیماً کھڑا ہونا اور عرضیاں لٹکانا اور اس کے دیکھنے کو ثواب سمجھنا سخت گناہ ہے اور بعض ان میں سے درجہ شرک تک پہنچے ہوئے ہیں۔ "اتعبدون ماتنحتون" کیا ایسی چیز کو پوجتے ہو؟ جس کو خود تراشتے ہو) میں داخل ہوکر موجب کفر وشرک ہے۔العیاذ باللہ۔

حضرت حسینؓ کی طرف اس کی نسبت اور ان کا نام اس پر چسپاں کرنا سخت حماقت ہے جو عقلاً وشرعاً ہر طرح سے منع ہے،نسبت سے بھی کسی شے میں تعظیم آجاتی ہے،لیکن یہ اسی وقت ہے جب کہ وہ نسبت سچی اور واقعی ہو۔

ہمارے اس مختصر سے تجزیہ سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ماہ محرم الحرام کی یہ عزت وعظمت ہنگامی یا ناگہانی نہیں بلکہ یہ شان محرم کی ازلی اور ابدی شان ہے۔ماہ محرم الحرام اپنے اس امتیاز میں کسی مکان وزمان کا پابند نہیں بلکہ خود زمان ومکان کسبِ شان میں محرم الحرام کے پابند ہیں۔اللہ تبارک وتعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلامی مہینوں کی محبت عطا فرمائے اور شرک وبدعات سے اور کافروں کی پیروی سے بچاتے ہوئے اپنے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین!!یارب العالمین

”وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ“

مدد کس سے مانگیں؟



ماخوذ از مجموعہ وظائف

وہ اس بات کو بہت محبوب رکھتا ہے کہ اسے کوئی پکارے۔ اور اسی پکار کو دعا کہتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے فرمایا: اے میرے فرشتوں! اگر میں بھی نہ سنوں تو صنم اور صمد میں کیا فرق ہوگا؟

خاتم الانبیاء، حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس وقت دنیا میں تشریف لاتے ہیں جبکہ رسولوں کی دی ہوئی تعلیم مٹ چکی ہے، ان کی راہیں بے نشان ہوچکی ہیں، دنیا توحید کو بھلا چکی ہے، جگہ جگہ مخلوق پرستی ہورہی ہے، سورج، چاند، ستارے، آگ پانی، بت وغیرہ کی پوجا کی جارہی ہے۔ خدا کا دین بدل چکا ہے، کفر کی تاریکی چھا چکی ہے، دنیا کا چپہ چپہ، کونہ کونہ، سرکشی اور زیادتی سے بھر گیا ہے، عدل اور انصاف بالکل مٹ چکا ہے، انسانیت بھی فنا ہوچکی ہے، جہالت اور کم فہمی کا دورہ دورہ ہے، سوائے بعض نفوس کے خدا کا نام لیوا زمین پر کوئی نہیں رہا۔ پس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جلالت اور عزت خدا کے پاس بہت بڑی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو خدائی رسالت ادا کی وہ کوئی معمولی رسالت نہیں تھی۔

میرے عزیز دوستو! تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اسی لیے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں کو تعلیم دیں اور سکھائیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اللہ ہی کی عبادت کرو اور اللہ ہی سے مدد مانگو۔ اور انسان پیدا بھی اسی لیے کیا گیا ہے۔ مگر انسان اپنی اپنی نفسانیت اور جہالت کی وجہ سے بھول جاتا ہے یا ضد میں آکر جانتے ہوئے بھی الٹا کرنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام مجید میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔“ (سورہ فاتحہ ۴)

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

کامل اطاعت اور پورے دین کا حاصل صرف یہی دو باتیں ہیں۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے کہ تم سب اسی کی خالص عبادت کرو اور اپنے تمام کاموں میں اسی سے مدد مانگو۔ (تفسیر ابن کثیر)

میرے عزیز دوستو! آج وہ لوگ سوچیں اور سمجھیں جو نماز میں روزانہ پانچوں وقت کئی مرتبہ اللہ کے سامنے نماز پڑھتے ہوئے اس بات کا اقرار کرتے ہیں ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔“ (ہم خالص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔) یہ آیت کریمہ نماز میں بار بار پڑھتے ہیں۔ یہ اقرار بھی کررہے ہیں اور جب نماز پڑھ لی تو اللہ ہی کے گھر میں اسی مصلے پر سے جب اٹھتے ہیں تو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو حاضر و ناظر اور نفع ونقصان میں مددگار سمجھ کر اسی وقت ان کے نام کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں۔

میرے عزیز دوستو! آپ ہی انصاف کریں۔ کوئی حد بھی ہے اس جہالت کی۔

میرے عزیز دوستو! مدد صرف اللہ ہی کی ہوتی ہے

اور اگر اللہ تعالیٰ ہماری مدد نہ کرے تو دنیا میں کوئی بھی ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ اب آئیے آپ کو وہ حدیثیں اور آیتیں سنائیں جن کو سننے اور پڑھنے سے ایمان تازہ ہوجاتا ہے اور توحید میں پکا پن آجاتا ہے۔ کیسی کیسی مشکلوں میں اللہ تعالیٰ نے مدد کی ہے اور ایسی ایسی سخت مصیبتوں میں بھی خدا کے بندوں نے توحید کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ہم کو سبق دے گئے، ہمارے ہی لیے نہیں بلکہ سارے جہاں کے لیے نمونہ بن گئے۔ جو عقل مند تھے، ایمان والے تھے، سمجھ والے تھے، انہوں نے بزرگانِ دین کے عمل کو ہاتھ میں لے لیا اور عمل کر کے بتادیا۔ باقی تو اپنی اپنی ضد اور نفسانیت ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :، ’’فَاسْتَجَبْنَالَهٗ، وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ، وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ‘‘ (سورۃ الانبیاء، ۸۸) ’تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی، ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچالیا کرتے ہیں۔‘‘

دیکھا میرے عزیز دوستو! اللہ تعالیٰ خود فرمارہے ہیں کہ میں ایمان والوں کو اس طرح سے بچالیتا ہوں چاہے سمندر کی تہہ میں ہو، یا طوفانِ دریا میں ہو، یا آگ کے الاؤ میں ہو، یا مچھلی کے پیٹ میں ہو۔ اسی وقت مچھلی کو حکم ہوتا ہے کہ اے مچھلی! میرے یونس کو اپنے پیٹ اور سمندر سے باہر نکال دے اور یہی ہوا بھی۔ اگر یونس علیہ السلام خدا تعالیٰ کی مدد نہ مانگتے، ان کو نہ پکارتے، ان کی تسبیح نہ پڑھتے تو ان کا انجام کیا ہوتا وہ بھی سن لیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سورہ صٰفّٰت میں ارشاد فرماتے ہیں :، اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے۔

اے میرے دوستو! اس سے بڑھ کر اب آپ کو توحید کے لیے اور کیا ثبوت چاہیے؟ خداوند عالم فرمارہے ہیں کہ اگر یونسؑ میری تسبیح نہ پڑھتے مجھ سے مدد نہ مانگتے، مجھے اپنی مصیبت میں یاد نہ کرتے تو قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں قید رہتے۔

کیونکہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی مصیبت میں ان کا مددگار نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :، ’’حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ‘‘ (سورہ آل عمران، ۱۷۳) ۔ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہیں اور وہ بہت ہی اچھا کارساز ہیں حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی زبان پر آخری کلمہ یہ تھا؛، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہیں۔

میرے عزیز دوستو! یہ تھا امتحان ایمان والوں کا اور یہ تھی کسوٹی۔ اب اللہ تعالیٰ کی رحمت کو دیکھیے جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ کی طرف پھینک دیا گیا تو جو بڑے بڑے فرشتے ہیں وہ تیار کھڑے تھے کہ نہ جانے اللہ تعالیٰ کس کو کب اور کیا حکم کرتے ہیں۔ یعنی حضرت جبرئیلؑ تیار کھڑے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے حکم دے تو میں حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں گرنے سے پہلے ہی بیچ راستے میں آسمان کی طرف اٹھالوں یا آگ کو سمندر میں ڈال دوں۔ اسی طرح حضرت میکائیلؑ بھی تیار کھڑے تھے کہ اگر مجھ کو اللہ تعالیٰ حکم کرے تو میں برسات کو اس آگ پر ایسا امنڈ دوں کہ ایک آن کی آن میں آگ بجھ جائے۔ اسی طرح ہَوا کا فرشتہ بھی تیار کھڑا تھا کہ اگر مجھے حکم ملے تو ایک پل میں آنکھ جھپکنے کے ساتھ ساری آگ کو اڑا کر لے جاؤں۔ مگر سب کے سب مجبور تھے۔ خدا کے حکم کے سوا کوئی کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ چاہے فرشتہ ہو، نبی ہو، ولی، قطب، ابدال، یا غوث۔ بہر حال اللہ تعالیٰ جب کسی کو بچانا چاہے تو وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ کہ اس کا کوئی کام کردے تب ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مقبول بندہ سمجھ کر اپنے رحم وکرم سے اپنے دربار میں قبول کرلیا بھلا وہ آگ ان کو کیا جلاسکتی تھی۔

رنج وغم کے وقت مومن کی شان

یاد رکھیے! درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رنج وغم، تکلیف ومصیبت وغیرہ دینے والا اور وہی ان مصیبتوں کو دور فرما کر راحت وآرام، صحت وتندرستی عطا فرمانے والا ہے۔ ہر چیز پر قادر اور مختار کل ہے وہ بڑا داتا ہے۔ وہ اس بات کو بہت محبوب رکھتا ہے کہ اسے کوئی پکارے۔ اور اسی پکار کو دعا کہتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔ ’’اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ‘‘ بھلا کوئی ہے جو بے قرار اور پریشان حال کی فریاد کو سنے جب کہ وہ اسے پکارے اور وہ تکلیف کو دور کردے۔

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ہی بے چین و بے قرار کی فریاد کو سنتا ہے اور اس کی مصیبتوں کو دور کرتا ہے ہر انسان مصیبت کو دور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا ضرور تلاش کرتا ہے حتیٰ کہ دہریئے خدا کے منکر ملحد اور بڑے بڑے مغرور بھی اپنی سمجھ اور عقیدے کے موافق اپنے سے بڑی ذات کا وسیلہ و ذرائع ٹھہراتے ہیں اور اس کے دامن کو پکڑ کر نجات حاصل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ بعضوں نے مورتیوں کو پکارا، کسی نے چاند، سورج، مریخ وغیرہ ستاروں کی منت وسماجت، خوشامد کی۔ اور دُہائی دی کہ اس آڑے وقت میں کام آئے مگر جب ان سے حاجت روائی نہیں ہوئی تو تمام مادی اور صوری اور

ظاہری ذریعوں سے منہ پھیر کر صرف ایک ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر نہایت عاجزی وانکساری اور آہ وزاری سے پکارتے اور دعائیں کرتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ان پریشان حال لوگوں کی پکار کو قبول فرما کر انہیں دامنِ رحمت میں چھپالیتے ہیں۔ جب اللہ ہی اس آڑے وقت اور مصیبت میں کام آنے والا ہے تو ہر حالت میں اسی کو پکارنا چاہیے۔ دوسرے عاجزوں محتاجوں کو پکارنے سے کیا فائدہ۔ کہ وہ تو اس پکار کو سنتے ہی نہیں۔ فائدہ پہنچانا تو دور کی بات ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ''وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ یَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَنۡ لَّا یَسۡتَجِیۡبُ لَہٗۤ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ وَ ہُمۡ عَنۡ دُعَآئِہِمۡ غٰفِلُوۡنَ'' (سورہ احقاف، ۵) ان سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی بات کو نہیں سن سکتے۔ وہ تو ان کی پکار سے بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ''اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ'' (سورہ اعراف، ۱۹۴) بے شک اللہ کے سوا جن کو تم اپنی مدد کے لیے پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے عاجز بندے ہیں۔ بلکہ وہ تم سے بھی زیادہ عاجز ہیں کیونکہ زندہ انسان اپنی بعض مصیبتوں کو دور کرسکتا ہے اور وہ بے جان تو اپنی مصیبتوں کو بھی دور نہیں کرسکتے دوسروں کی مصیبت کو کیا دور کریں گے؟

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَکُمۡ وَلَاۤ اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ'' (سورہ اعراف، ۱۹۷)۔ ترجمہ، وہ لوگ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو نہ وہ تمہاری مدد کرسکتے ہیں اور نہ وہ اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں۔ آیت مذکورہ سے یہ ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں سب ہیچ اور بے بس ہیں کوئی کسی کی مدد کرکے تکلیف کو دور نہیں کرسکتا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب کی مدد کرتا ہے۔ لہذا ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکاریں۔ اور اسی سے دعا کریں اور اس پکار میں دوسرے کو شریک نہ کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا'' (سورہ جن ۱۸)۔ ترجمہ، اللہ کے سوا کسی کو مت پکارو۔ اسی طرح میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وہ دعاؤں کو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ وہ ایسا سننے والا ہے کہ زمین پر چلنے والی چیونٹی کے چلنے کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ وہ ایسا مہربان ہے کہ دشمن کی بھی سنتا ہے اور مدد کرتا ہے۔

''وَلَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ'' (سورہ یونس ۱۰۶) اللہ تعالیٰ کے سوا ان چیزوں کو مت پکارو جو پکارنے سے فائدہ (نہ پکارنے سے کچھ) تکلیف نہ پہنچا سکے پھر اگر تم ایسا کروگے تو اس وقت یقیناً ظالموں میں سے ہوجاؤ گے۔ ان آیات کے ترجموں کو خوب غور سے پڑھیں اور بار بار پڑھیں اور کسی حال میں بھی کسی پریشانی پر بھی کسی نجومی، دست شناس، فال نکالنے والا، کالے علم کرنے والا، جادوگر، عامل، کامل، روحانیت کے دعویدار، جھوٹے پیر وغیرہ کے پاس کبھی نہ جائیں نہ ہی خطوط کے ذریعے کوئی بات پوچھیں یا عمل کریں۔

حدیث شریف میں بھی صاف طور پر علم نجوم کرنے اور کروانے اور نجومیوں (دست شناس، جوتشی، غیر شرعی عامل، کامل) سے بات پوچھنے اور ان کی تعریف کرنے والے پر سخت وعید آئی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سچا جانے تو وہ اس چیز (یعنی قرآن، سنت وشریعت) سے بری ہوا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اسی طرح ایک دوسری روایت میں بعض ازواج مطہرات ؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس سے کچھ پوچھے (یعنی غیب کی باتیں پوچھے) تو اس کی چالیس دن رات کی نمازیں قبول نہیں کی جاتیں۔ ایک اور حدیث میں حضرت عمران بن حصین ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے شگون لیا یا اس کے لیے (اس کی مرضی سے) شگون لیا گیا یا جو نجومی کے پاس آیا یا (اس کی مرضی سے) اس کے لیے کوئی اور آیا یا جس نے جادو کیا یا جس کے لیے (اس کی مرضی سے) جادو کرایا گیا۔ ان احادیث سے بھی معلوم ہوا کہ یہ چیز سخت نقصان دہ ہے اور انتہائی بدبختی کی علامت ہے اس کی وجہ سے نماز جو عبادات میں سب سے افضل اور اہم ترین عمل ہے نا مقبول ہوجاتی ہے۔ تو جب نماز ہی قبول نہیں تو دوسرے اعمال بطریق اولیٰ قبول نہیں ہونگے۔

جب سب کے سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے محتاج ہیں اور ایک اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ''وحدہٗ لاَ شریک لہٗ'' ہی بے نیاز ہے، اس کارخانہ قدرت کا

تنہا چلانے والا ہے، کائنات میں سب سے زیادہ محبت کرنے والا ہے، اچھائی کی قدر کرنے والا ہے، رحم کرنے والا، انصاف کرنے والا، چھوٹی بڑی چیز کا جاننے والا اور بڑی سے بڑی چیز اور مشکل کام کو نیست سے ہست کرنے والا اور ناممکن کو ممکن بنا دینے والا، وہ کسی کا محتاج نہیں سب کے سب اس کے محتاج ہیں، تو پھر کیوں نہ اسی سے مانگا جائے، ہر مشکل، ہر مصیبت میں اسی کو پکارا جائے۔

کہتے ہیں کہ اورنگزیب عالمگیرؒ کے زمانے میں ایک شخص ان کے دربار میں اپنی حاجت لیکر حاضر ہوا کہ بادشاہ کے پاس جا کر کہوں گا تو وہ کچھ دیں گے اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ خادم نے کہا: آپ انتظار کیجئے، بادشاہ چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، پھر دعا سے فارغ ہونے کے بعد سائل کو سلام کیا، پوچھا: کس ضرورت سے آنا ہوا؟ سائل نے کہا: میں جا رہا ہوں جس ضرورت سے آیا تھا وہ مسئلہ حل ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا: پھر بھی بتلاؤ تو سہی، اتنے دور سے سفر کر کے آئے ہو، کیا پریشانی تھی؟ سائل کہنے لگا: میں اپنی ایک پریشانی کے سلسلہ میں آیا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے نماز پڑھ کر کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلائے تو میں نے سوچا کہ جب آپ بھی کسی سے مانگ رہے ہیں اور جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے تو کیوں نہ میں بھی اسی سے مانگ لوں۔ آپ جو مجھے دیں گے وہ اسی سے مانگ کر دیں گے۔

اس واقعہ میں ہم سب کے لیے سبق ہے کہ ہر پریشانی، ہر ضرورت کے وقت اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے مانگیں اور بار بار مانگیں۔ کبھی مایوس نہ ہوں۔ وہ دعاؤں کو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ وہ ایسا سننے والا ہے کہ زمین پر چلنے والی چیونٹی کے چلنے کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ وہ ایسا مہربان ہے کہ دشمن کی بھی سنتا ہے اور مدد کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک کافر اپنے بت کو پکار رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اے صنم، اے صنم! اس کی زبان سے غلطی سے نکل گیا: اے صمد، اے صمد! اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو ہماری رحمت سے ڈھانپ لو۔ فرشتوں نے کہا: اے اللہ اس نے غلطی سے کہا تھا۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: اے میرے فرشتوں! اگر میں بھی نہ سنوں تو صنم اور صمد میں کیا فرق ہوگا؟ اس لیے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے، یہ خیال دل میں آئے تو اس کو دور کر دیں کہ ہم گناہگار ہیں، ہماری دعا کیوں قبول ہوگی، وہ صنم کہنے والوں کی سنتا ہے ہم تو الحمد للہ مسلمان ہیں۔ ہم کیوں مایوس ہوں، اس لیے خوب مانگیں، بار بار مانگیں، وہ ایسا کریم ہے کہ اس سے نہ مانگیں تو ناراض ہو جاتا ہے۔ مانگنے والے مانگ مانگ کر تھک جاتے ہیں، وہ دے دے کر نہیں تھکتا، ہمارے دلوں میں اس بات کا یقین بیٹھ جائے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ وہ کتنا طاقتور ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" (سورہ مومن، ۶۰)

اور تمہارے رب کا فرمان ہے کہ تم مجھ سے مانگو، میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

پھر کیوں نہ مانگیں، ہر فرض نماز کے بعد مانگیں، رات کو ۲ بجے ۳ بجے جب سب سو رہے ہوں اس وقت مانگیں، آپ مانگ کر تو دیکھیں، کیسے آپ کے مسائل حل ہوتے ہیں اور کہاں سے حل ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے مسائل ایسی جگہ سے اور اس طرح حل کر دیں گے کہ آپ کو وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔

اور یاد رکھیے! سب سے بڑا تعویذ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا ہے اور پھر دعا ہے لکھا ہوا دعا یا تعویذ تو ان معذوروں کے لیے ہوتا ہے جو دعا نہ مانگ سکیں، اس لیے ان دعاؤں کو معمول بنا کر ان کو پڑھیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ چالیس دن پڑھیں آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی اسی طرح یاد رکھیے جھوٹے پیروں، کالے علم والوں اور نجومیوں کے تعویذ گنڈوں سے اکثر دل کی بے چینی بڑھتی ہے اور گھروں میں فسادات ہوتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ ناراض ہو جائیں اس کی بنی بنائی دنیا بھی بگڑ جاتی ہے اور آخرت میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رحم فرمائے۔ لہٰذا آج سے پچھلی زندگی میں جو کچھ ہوا اس پر توبہ استغفار کریں اور آئندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار کے علاوہ کسی اور جگہ نہ بھٹکیں۔ اس دربار میں نہ کسی کی سفارش کی ضرورت ہے، نہ پیسے کی ضرورت ہے، نہ وقت کی پابندی ہے، صرف وضو کریں، دو رکعت "صلوٰۃ الحاجت" پڑھ کر مانگیں۔ اور حیاۃ الصحابہؓ کا بھی مطالعہ کریں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے مسائل، اپنی پریشانیاں کس طرح دو رکعت نماز پڑھ کر حل کروائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اپنی ذاتِ ذوالجلال پر بھروسہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے شرک سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

صبر کیا ہے؟

"جوشخص صدمے کے وقت چہرے پر دوہتڑ مارے گریبان پھاڑے، اور جہالت کے بول بولے، وہ ہم میں سے نہیں۔

ابوعبداللہ (صابر)

ہر انسان نے کل کو جانا ہے اور اپنی جان کو بیچنا ہے تو کوئی تو اپنی جان کو چُھڑانے والا ہے اور کوئی اس کو ہلاک کرنے والا۔

''صبر'' ایک ایسا عظیم اور اعلیٰ فضیلت والا عمل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں (علیہم الصلوٰۃ و السلام) کی صفات میں تعریف کرتے ہوئے بیان فرمایا۔

"وَإِسماعِيلَ وَإِدرِيسَ وَذَا الكِفلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ [سورة الانبياء ۸۵]۔ اور اِسماعیل اور اِدریس اور ذاالکِفل (علیہم السلام) سب ہی صبر کرنے والوں میں سے تھے۔

اور اس صبر کو ایک نیک عمل قرار فرماتے ہوئے اُس کا پھل یہ بتایا:۔"وَ أَدخَلنَاهُم فِي رَحمَتِنَا إِنَّهُم مِّنَ الصَّالِحِينَ [سورۃالانبیاء۸۶]

اور ہم نے (اُن کے صبر کرنے کے نتیجے میں) اُن سب کو اپنی رحمت میں داخل فرمالیا کہ وہ (یہ) نیک عمل کرنے والے تھے۔

اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے آخری رسول مُحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بتایا کہ یہ عظیم کام بہت بُلند حوصلہ رسولوں کی صفات میں رہا ہے اور اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس کام کا حکم فرمایا:

"فَاصبِر كَمَا صَبَرَ أُولُوا العَزمِ مِنَ الرُّسُلِ" [سورة الاحقاف ۳۵]۔ اور (اے مُحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ بھی اُسی طرح صبر فرمایئے جس طرح (آپ سے پہلے) حوصلہ مند ''رسولوں'' نے فرمایا۔

حقیقی صبر وہ ہے جو کسی صدمے کی ابتداء میں ہی اختیار کیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اُن پر میرا سب کچھ قُربان ہو، ہمیں یہ عظیم حقیقت بھی بتاتی کہ "إِنَّمَا الصَّبرُ عِندَ الصَّدمَةِ الأُولَى"۔ [متفق علیہ صحیح بخاری کتاب الجنائز، باب ۴۱]، بے شک صبر (تو وہ ہے جو) کسی صدمے کی ابتداء میں کیا جائے۔

صبر کی اُہمیت، عظمت اور دُنیا و آخرت کے فوائد کا اندازہ اس بات سے خوب اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قُرآن کریم میں ہمیں بہت دفعہ، اور ہماری زندگیوں کے مختلف حالات میں صبر اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ "وَاصبِر وَمَا صَبرُكَ إِلاَّ بِاللّهِ وَلاَ تَحزَن عَلَيهِم وَلاَ تَكُ فِي ضَيقٍ مِّمَّا يَمكُرُونَ [سورۃ النخل، ۱۲۷]

اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر سوائے اللہ کی (دی ہوئی) توفیق کے ہو نہیں سکتا اور آپ ان لوگوں (کے کفر و عناد کی وجہ سے ان کے لیے غمزدہ مت ہوں اور نہ ان لوگوں کی مکاریوں کی وجہ سے تنگی میں ہوں۔

شدید سختی والے کام کرتے رہنے میں صبر کیے رکھنے کا حُکم:۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے شرعی اور قدری احکام اور فیصلوں کی مثال دے کر اس بات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"فَاصبِر لِحُكمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِع مِنهُم آثِماً أَو كَفُوراً" (سورۃ دہر، آیت ۲۴)۔

اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ رب کے حکم پر صبر کیجیے اور اُن (کفار و مشرکین) میں سے کسی بھی گنہگار یا ناشکرے کی اطاعت مت کیجیے گا۔

"لَتُبلَوُنَّ فِي أَموَالِكُم وَأَنفُسِكُم وَلَتَسمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الكِتَابَ مِن قَبلِكُم وَمِنَ الَّذِينَ أَشرَكُوا أَذًى كَثِيراً وَإِن تَصبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِن عَزمِ الأُمُورِ [سورہ آل عمران، ۱۸۶]

تُم لوگ ضرور تُمھاری جانوں اور مال میں آزمائے جاؤ گے اور ضرور جنہیں تُم سے پہلے کتاب دی گئی اُن سے ، اور شرک کرنے والوں سے بہت زیادہ تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تُم لوگ صبر کرو گے اور اللہ سے بچو گے تو بے شک ایسا کرنا بہت بڑی ہمت والا کام ہے۔

یہاں یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے:۔ کہ کافروں، مُشرکوں وغیرہ کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور پریشانیوں پر صبر سے مُراد یہ نہیں کہ ان کے ظُلم، کفر، شرک اور عناد کو ہمیشہ اور ہر طرح برداشت ہی کیا جاتا رہے گا، نہیں، بلکہ ان کو اسلام کی دعوت دینے، حق اُن پر واضح کرنے ، اور نہ ماننے کی صورت میں، یا، اُن کی طرف سے اللہ کی شان میں گستاخی، یا اللہ کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی ، اللہ کے دِین کے خلاف کام کرنے، مُسلمانوں کی جان و مال وعزت پر حملہ آور ہونے یا کسی بھی صورت میں اسے نُقصان پہنچانے کی صورت میں اُن کو ہر ممکنہ طور پر نہ صرف روکنے بلکہ ان کے خلاف با قاعدہ جہاد کرنے کا حکم ہے ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یعنی نیکیوں کا حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے میں جو کوئی مُصیبت اور مشقت پیش آئے اس پر صبر کیے رکھنے کا حکم اپنے ایک نیک بندے کو پیغام کے طور پر فرمایا:

چنانچہ اللہ رب العزت کا ارشادِ گرامی ہے:۔

"یا بُنَیَّ أَقِمِ الصَّلوٰةَ وَأمُر بِالمَعرُوفِ وَانهَ عَنِ المُنكَرِ وَاصبِر عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِن عَزمِ الأُمُورِ" [سورہ لقمان ۱۷]

اے میرے بیٹے نماز قائم کر اور نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو کوئی مُصیبت تمہیں پیش آئے اس پر صبر کر بے شک یہ بڑی ہمت والا کام ہے۔

"اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیشہ صبر کرنے کا حکم دیتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ اس عظیم خیر وخوبی والی صفت کو حاصل کرنے کا طریقہ تعلیم فرماتے ہوئے انصار رضی اللہ عنہم اجمعین کو ارشاد فرمایا:

"مَا يَكُون عِندِى مِن خَيرٍ لَا أَدَّخِرهُ عَنكُم وَإِنَّهُ مَن يَستَعِفّ يُعِفَّهُ اللهُ وَمَن يَتَصَبَّر يُصَبِّرهُ اللهُ وَمَن يَّستَغنِ يُغنِهِ اللهُ وَلَن تُعطَوا عطاءً خَيرًا وَأَوسَعَ مِن الصَّبرِ"

[صحیح بخاری، ۶۱۰۵، کتاب الرقاق، باب ۲۰]

میرے پاس خیر میں سے جو کچھ ہوتا ہے وہ تُم لوگوں سے بچا کر نہیں رکھتا اور بے شک جو عفت طلب کرتا ہے اللہ اسے عفت عطا فرماتا ہے، اور جو صبر کرتا ہے اللہ اسے صبر دیتا ہے اور جو غِنا طلب کرتا ہے اللہ اسے غنی کر دیتا ہے، اور تُم لوگوں کو صبر سے بڑھ کر خیر اور وسعت والی کوئی اور چیز ہرگز عطا نہیں کی گئی۔

"جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ خیر خواہی کرنا چاہے تو اسے اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں جلد دے دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ سختی کرنے کا ارادہ کرے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا کو روک لیتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے پوری پوری سزا دے گا۔

اور صبر کو اللہ تعالیٰ نے، اس کی مدد کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: "واستَعِينُوا بِالصَّبرِ وَالصَّلوٰةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الخَاشِعِينَ" [سورہ بقرہ ۴۵]

(اے ایمان والو) صبر اور نماز کے ذریعہ (اللہ سے) مدد طلب کرو اور بے شک (اللہ سے) ڈرنے والوں کے علاوہ دوسروں کے لیے ایسا کرنا بہت بڑی مشکل (والا کام) ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور آپس کی اتفاق کو بھی صبر کے ساتھ ہی جوڑتے ہوئے فرمایا:۔

"وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفشَلُوا وَتَذهَبَ رِيحُكُم وَاصبِرُوا إِنَّ اللهَ مَعَ الصَّابِرِينَ" [سورہ انفال ۴۶]۔

اور اللہ اور اس کے رسول [ﷺ] کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِين" [سورہ آل عمران ۱۴۶]۔

اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

"وَبَشِّرِ المُخبِتِينَ" [سورۃ الحج ۳۴]۔ اور (اے رسول صلی ﷺ ایمان پر) اطمینان رکھنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔

"الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَت قُلُوبُهُم وَالصَّابِرِينَ عَلَى مَا أَصَابَهُم" [سورۃ الحج ۳۵]

یہ وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذِکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور جو کچھ (مُصیبت پریشانی وغیرہ) انہیں آن پڑتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں،

ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ رسول اللہ صلی ﷺ نے فرمایا:

"الطُّهُورُ شَطرُ الإِيمَانِ وَالحَمدُ لِلّهِ تَملأُ المِيزَانَ وَسُبحَانَ اللهِ وَالحَمدُ لِلّهِ تَملآنِ أَو تَملأُ مَا بَينَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرضِ وَالصَّلوٰةُ نُورٌ وَالصَّدَقَةُ بُرهَانٌ وَالصَّبرُ ضِيَاءٌ وَالقُرآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَو عَلَيكَ كُلُّ النَّاسِ يَغدُو فَبَايِعٌ نَفسَهُ

فَمُعتِقُهَا أَو مُوبِقُهَا" [صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب اول]

طہارت ایمان کا حصہ ہے اور الحمد للہ (کہنا) میزان (ترازو) کو بھر دیتا ہے اور سُبحان اللہ اور الحمد للہ (کہنا) آسمانوں اور زمین کے درمیان کو بھر دیتا ہے اور نماز روشنی ہے، اور صدقہ واضح دلیل ہے، اور صبر چمک ہے، اور قرآن حجت ہے (یا خود) تمہارے لیے (یا خود) تمہارے خِلاف، ہر انسان نے کل کو جانا ہے اور اپنی جان کو بیچتا ہے تو کوئی تو اپنی جان کو چُھڑانے والا ہے اور کوئی اس کو ہلاک کرنے والا۔

اللہ تعالی کی تقدیر پر صبر کرنا ایمان باللہ کا حصہ ہے۔۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:" وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" (سورۃ التغابن، 11)

"اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے، اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں علقمہؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ شخص ہے جسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اسے اللہ تعالی کا فیصلہ سمجھ کر اس پر راضی ہو اور دل سے اسے تسلیم کرے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: الطَّعْنُ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ " (صحیح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ إِطْلَاقِ اسْمِ الْكُفْرِ عَلَى الطَّعْنِ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةِ عَلَى الْمَيِّتِ ٦٧)

"لوگوں میں دو کام ایسے ہیں جو کفر ہیں، ایک تو کسی کے نسب پر طعن کرنا اور دوسرے میت پر نوحہ کرنا۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ، وَشَقَّ الْجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ" (صحيح البخاري، كِتَابُ الجَنَائِزِ، بَابٌ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الخُدُودَ، ح: 1297)

"جو شخص صدمے کے وقت چہرے پر دو ہتڑ مارے گریبان پھاڑے، اور جہالت کے بول بولے، وہ ہم میں سے نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"

إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدِهِ الخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ العُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا، وَإِذَا أَرَادَ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتَّى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ القِيَامَةِ" (سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّبْرِ عَلَى البَلَاءِ، ح: 2396)

"جب اللہ تعالی اپنے کسی بندے کے ساتھ خیر خواہی کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں جلد دے دیتا ہے اور جب اللہ تعالی اپنے کسی بندے کے ساتھ سختی کرنے کا ارادہ کرے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا کو روک لیتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے پوری پوری سزا دے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا:

"إِنَّ عِظَمَ الجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ البَلَاءِ، وَإِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ" (جامع الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّبْرِ عَلَى البَلَاءِ، ح: 2396)

"بڑی آزمائش کی جزا بھی بڑی ہوتی ہے اور اللہ تعالی کو جن لوگوں سے محبت ہو وہ انہیں آزماتا ہے۔ جو شخص اس آزمائش پر راضی ہو، اللہ تعالی اس سے راضی ہو جاتا ہے اور جو شخص اس آزمائش پر ناخوش ہو، اللہ تعالی بھی اس سے ناخوش اور اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔"

ان تمام احادیث کا حاصل کلام چند باتوں میں پوشیدہ ہے۔

(۱) اللہ تعالی کی تقدیر پر صبر کرنا انتہائی عظیم الشان اور جلیل القدر عبادت ہے کیونکہ اللہ تعالی کے احکام پر عمل کرنا اور اس کی منہیات سے رکنا صبر ہی سے ممکن ہے۔ صبر کی تین اقسام ہیں:۔ (۱) زبان سے اللہ تعالی کا شکوہ نہ کرنا۔ (۲) قلبی طور پر ناراضی محسوس نہ کرنا۔ (۳) اعضاء کے ذریعہ بے صبری کا اظہار نہ کرنا...... یہ سب صبر ہی ہے۔

(۲) جو شخص اللہ پر ایمان لا کر اس کی کماحقہ تعظیم کرے، اس کے اوامر کو بجالائے اور اس کے نواہی سے بچ کر رہے تو اللہ اس کے دل کو عبادت، صبر اور اس کی تقدیر پر راضی رہنے پر تیار کر دیتا ہے۔

(۳) (تفسیر ابن جریر الطبری، رقم 26496)

حضرت علقمہؒ کا قول نہایت درست اور صواب پر مبنی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔ یاد رہے! مصائب اللہ تعالی کی تقدیر سے آتے ہیں اور تقدیر کا دارومدار اللہ تعالی کی حکمت پر ہوتا ہے اور اللہ عزوجل کی حکمت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ ہر امر کو اس کے انجام کے مناسب وموافق مقام پر رکھا جائے جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جب بھی بندے کو مصیبت پہنچے تو اللہ کی طرف سے بندے کے لیے اسی میں خیر ہوتی ہے۔ اب اگر اس پر صبر کرے گا تو عنداللہ ماجور ہوگا اور اگر ناراضی کا اظہار اور شکوہ کرے گا تو گناہ گار ٹھہرے گا۔

(۴) دو کام ایسے ہیں جو اکثر لوگوں میں موجود ہیں اور موجود رہیں گے: نسب پر طعن کرنا اور نوحہ کرنا۔

بقیہ صفحہ (51) پر

حضرت مولانا پیر ذوالفقار نقشبندی (مدّظلّہ العالی)

وضو کی حکمتیں اور اس کے فوائد

ایک روایت کا مفہوم ہے کہ اگر تم پابندی سے مسواک کرو گے تو تمہاری عورتیں پاکدامنی کی زندگی گزاریں گی۔

پس لا الہ کا مقصود یہ ہے کہ مخلوق سے کٹو اور الا اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالی سے جڑو۔

ارشاد باری تعالی ہے: "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ" (سورۃ المائدہ، ۵)۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کی طرف قیام کا ارادہ کرو تو تم اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو اور اپنے سر کا مسح کرلو۔ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز سے پہلے وضو کرنا لازمی ہے۔ حدیث پاک میں وارد ہوا ہے "الصلوۃ مفاتیح الجنۃ ومفاتیح الصلوۃ الطهور"۔ جنت کی کنجیاں نماز ہیں اور نماز کی کنجیاں وضو ہے۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ وضو کے اعضاء قیامت کے دن روشن ہوں گے جس کی وجہ سے نبی ﷺ اپنے امتی کو پہچان لیں گے۔

وضو کرنے والے کے سر پر اللہ تعالی کی رحمت کی چادر ہوتی ہے، جب وہ دنیا کی باتیں کرتا ہے تو چادر ہٹ جاتی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جو شخص وضو شروع کرتے وقت "بِسْمِ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ علٰی دِیْنِ الاِسلامِ" پڑھے اور وضو کے اختتام پر کلمہ شہادت پڑھے اس کے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

فضائل وضو

ایک حدیث پاک میں آیا ہے "اَلْوُضُوْءُ سَلَاحُ الْمُؤمِن" وضو مومن کا ہتھیار ہے۔ جس طرح ایک انسان اسلحہ کے ذریعے اپنے دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اسی طرح مومن وضو کے ذریعے شیطانی حملوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ امام غزالیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنے قلبی احوال پر نظر ڈالو تمہیں وضو سے پہلے اور وضو کے بعد کی حالت میں واضح فرق نظر آئے گا۔

ہمارے مشائخ اپنی زندگی باوضو گزارنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ حدیث پاک میں ہے:- "اَنتُم تَموتُونَ کَمَا تَعِیْشُونَ" تم جس طرح زندگی گزارو گے تمہیں اسی طرح موت آئے گی۔ اس حدیث پاک سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جو شخص اپنی زندگی باوضو گزارنے کی کوشش کریگا اللہ تعالیٰ اسے باوضو موت عطا فرمائیں گے۔

(نوٹ) یہاں طوالت کے سبب بعض واقعات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

مسواک کا اہتمام

ایک حدیث پاک میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے امت پر بوجھ کا ڈر نہ ہوتا تو مسواک کرنا فرض قرار دے دیتا۔ ایک روایت میں ہے جو نماز مسواک کے ساتھ وضو کرکے پڑھی جائے وہ اس نماز سے ستر گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے جو بغیر مسواک کے پڑھی جائے۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ مسواک کے اہتمام میں ستر فائدے ہیں ایک یہ ہے کہ مرتے وقت کلمہ نصیب ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ مسواک کا اہتمام کرو اس میں دس

فائدے ہیں ۔ (۱) منہ کو صاف کرتی ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔ (۳) شیطان کو غصہ دلاتی ہے ۔ (۴) اللہ تعالیٰ اور فرشتے مسواک کرنے والے سے محبت کرتے ہیں۔ (۵) مسوڑھوں کو قوت دیتی ہے ۔ (۶) بلغم کو قطع کرتی ہے ۔ (۷) منہ میں خوشبو پیدا کرتی ہے ۔ (۸) صفراء کو دور کرتی ہے ۔ (۹) نگاہ کو تیز کرتی ہے ۔ (۱۰) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔

علامہ شامیؒ نے رد المختار میں مختصراً مسواک کرنے کے مواقع کو تحریر فرمایا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱، وضو کے وقت ۔ ۲، لوگوں کے اجتماع میں شامل ہونے سے قبل۔ ۳، منہ میں بدبو ہو جانے پر۔ ۴، نیند سے بیدار ہونے پر۔ ۵، نماز سے پہلے اگر چہ وہ پہلے سے باوضو ہو۔ ۶، گھر میں داخل ہونے کے وقت ۔ ۷، قرآن کریم کی تلاوت کے وقت۔

✷ مومن کو چاہیے کہ اپنے منہ کو صاف رکھے۔ چونکہ اسی منہ سے اللہ رب العزت کا کلام پڑھنا ہوتا ہے۔ ✷ صحابہ کرامؓ مسواک کی اتنی پابندی کرتے تھے کہ مسواک کو اپنے کان پر قلم کی طرح رکھا کرتے تھے ۔ ✷ ایک روایت میں ہے کو جو شخص پابندی سے مسواک کرے موت کے وقت عزرائیل علیہ السلام اسے کلمہ یاد دلاتے ہیں ۔ ✷ ایک روایت کا مفہوم ہے کہ اگر تم پابندی سے مسواک کرو گے تو تمہاری عورتیں پاکدامنی کی زندگی گزاریں گی ۔ ✷ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ تین چیزیں حافظہ کو قوی کرتی ہیں ۔ ۱، مسواک ۔ ۲، تلاوتِ قرآن ۔ ۳، روزہ۔

✷ بعض عورتیں اخروٹ کے درخت کی چھال استعمال کرتی ہیں جس سے منہ صاف ہو جاتا ہے وہ مسواک کے قائم مقام ہے ۔ پیلو کے درخت کی مسواک بھی بہت اچھی ہوتی ہے ۔ ✷ بعض لوگ برش اور پیسٹ سے منہ صاف کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ آج کل کی غذائیں اتنی مرغن ہوتی ہیں کہ اگر صرف لکڑی کی مسواک استعمال کی جائے تو دانت صحیح صاف نہیں ہوتے ، ایسی صورت میں برش سے دانت صاف کرنا ضروری ہوتے ہیں ، مسواک کرنے کا مقصد صرف خانہ پُری نہیں ہوتی بلکہ منہ کو صاف کرنا ہوتا ہے اگر کسی کے دانت مسواک سے صاف نہ ہوں تو برش پیسٹ سے صاف کرنے چاہئیں ۔ ✷ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب بھی باہر سے گھر تشریف لاتے تھے تو اپنے دہن مبارک کو مسواک کے ذریعے خوب صاف فرماتے تھے ۔ ✷ آج کل کی سائنسی تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ رات کو سوتے وقت اپنے دانتوں کو ضرور صاف کرنا چاہیے ۔ اکثر لوگوں کے دانت رات کے اوقات میں زیادہ بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں ، منہ بند ہوتا ہے ، بیکٹیریا کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع مل جاتا ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ رات کو سونے سے پہلے مسواک کر لیا کرتے تھے۔ اس سنت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

معارف وضو

درج ذیل میں وضو سے متعلق چند اسرار و رموز بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) وضو کو یکسوئی اور توجہ سے کرنا اعلیٰ مرتبہ کی نماز پڑھنے کا مقدمہ ہے ۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو عادتاً غفلت سے وضو کرے مگر نماز حضوری کے ساتھ پڑھے ، پس معلوم ہوا کہ اہتمامِ وضو اور حضوریِ نماز میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

(۲) مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ درحقیقت وضو 'انفصال عن الخلق' (مخلوق سے کٹنا) ہے، جبکہ نماز 'اتصال مع الحق' (اللہ تعالیٰ سے جڑنا) ہے۔ جو شخص جس قدر مخلوق سے کٹے گا اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ سے جڑے گا۔ یہی مطلب ہے 'لا الہ الا اللہ' کا پس لا الہ کا مقصود یہ ہے کہ مخلوق سے کٹو اور الا اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جڑو ۔ ماسویٰ اللہ سے قلبی تعلق توڑنے کو عربی زبان میں تبتل کہتے ہیں ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔" وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔" (المزمل ، ۸) اور اپنے رب کا نام پڑھے جا اور سب سے الگ ہو کر اسی کی طرف سب چھوڑ کر چلا آ۔

(۳) پانی کی خاصیت یہ ہے کہ آگ کو بجھا دیتا ہے۔ لہذا جو شخص وضو کر کے حضوری کے ساتھ نماز ادا کرے گا تو اس شخص کے لیے نماز دوزخ کی آگ سے ڈھال بن جائیگی۔

(۴) وضو میں شش جہات (چھ اطراف) سے پاکیزگی حاصل کی جاتی ہے دائیں ہاتھ سے دائیں طرف ، بائیں ہاتھ سے بائیں طرف ، چہرہ دھونے سے آگے کی طرف ، گردن کا مسح کرنے سے پیچھے کی طرف ، سر کا مسح کرنے سے اوپر کی طرف ، اور پاؤں دھونے سے سے نیچے کی طرف سے پاکیزگی حاصل ہو گئی۔

(۵) وضو کرنے سے انسان چھ اطراف سے پاکیزہ ہو گیا ، پس محبوب حقیقی سے ملاقات کی تیاری مکمل ہو گئی ۔ جب نماز ادا کرے گا تو اسے ملاقات بھی نصیب ہو جائے گی۔ ارشاد فرمایا : "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ" تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کر جیسے کہ

اسے دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ ''اَلصَّلوٰۃُ مِعرَاجُ الْمُؤمِن'' نماز مومن کی معراج ہے۔ حدیث پاک میں بتایا گیا ہے کہ آدمی جب وضو کرتا ہے تو اعضاء دھلنے کے ساتھ ہی ان سے کیے گئے گناہ بھی دھل جاتے ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کو ایسا کشف نصیب ہوگیا تھا کہ وہ وضو کے پانی کے ساتھ گناہ جھڑتا دیکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے وضو کے مستعمل پانی کو مکروہ کہا۔ ویسے بھی نمازی کو حکم ہے کہ وضو کا پانی کپڑوں پر نہ گرنے دے۔ بعض مشائخ کا معمول تھا کہ وضو کے وقت جو لباس زیب تن فرماتے تھے اسے بدل کر نماز ادا فرماتے تھے۔

شرع شریف میں پاکیزگی اور طہارت کو بہت پسند کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:، ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔'' (البقرہ ، ۲۲۲) بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے اور پاکیزہ رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ توبہ کرنے سے گناہ معاف ہوئے تو انسان باطنی طور پر پاکیزہ ہوگیا۔ حدیث پاک میں اسی مضمون کو مثال سے سمجھایا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے نہر بہتی ہو اور وہ دن میں پانچ مرتبہ غسل کرے تو اس کے جسم پر میل کچیل نہیں رہ سکتی۔ جو شخص پانچ مرتبہ اہتمام سے وضو کرے اور حضوری سے نماز ادا کرے اس کے دل پر سیاہی نہیں رہ سکتی۔

(۶) شرع شریف کا حسن وجمال دیکھئے کہ وضو میں سارا جسم دھلوانے کی بجائے صرف انہی اعضاء کو دھلوانے پر اکتفا کیا گیا جو اکثر وبیشتر کام کاج کے دوران کھلے رہتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ، پاؤں، بازو، چہرہ وغیرہ۔ جو اعضاء کم کھلتے ہیں ان کا مسح کروایا گیا مثلاً سر اور گردن۔ جو اعضاء پردے میں رہتے ہیں ان کو مستثنیٰ قرار دیا گیا مثلاً شرمگاہ وغیرہ۔

(۷) وضو میں جن اعضاء کو دھلوایا گیا، قیامت کے دن انہی کو نورانی حالت عطا کی جائے گی، حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ کہ قیامت کے دن میری امت اپنی اعضاء کی نورانیت سے پہچان لی جائے گی۔

(۸) وضو میں جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے قیامت کے دن ان اعضاء کو عزت وشرافت سے نوازا جائے گا جیسے فرمایا: ''وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ'' اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے، سر کو عرش الٰہی کا سایہ عطا کیا جائیگا (حدیث پاک میں آتا ہے ''یوم لاظلّ الّا ظلّ عرشہ'' قیامت کے دن عرش الٰہی کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا) پاؤں کو پل صراط پر چلتے وقت استقامت عطا کی جائیگی۔

دن میں چند بار آنکھوں میں تازہ پانی کے چھینٹے مارے جائیں تو آنکھیں کئی بیماریوں سے محفوظ ہوجاتی ہیں، خاص طور پر صبح کے وقت جب کہ ہوا میں اوزون (03) کافی مقدار میں موجود ہوتی ہے پانی کے چھینٹے آنکھوں میں مارنے سے انسان موتیابند کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔

وضو میں چند علمی نکات

(نکتہ ۱) وضو میں پہلے ہاتھ دھوتے ہیں، کلی کرتے ہیں، ناک میں پانی ڈالتے ہیں پھر چہرہ دھونے کی باری آتی ہے۔ اب ایک طالبعلم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرض کا درجہ سنت سے زیادہ ہے تو پھر پہلے چہرہ دھلواتے بعد میں دوسرا کام کرواتے۔ مگر وضو میں سنت عمل کو فرض عمل پر مقدم کیا گیا۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: پانی سے اس وقت وضو کیا جاسکتا ہے جبکہ پانی پاک ہو، اگر پانی ہی ناپاک ہو تو وضو ہوگا ہی نہیں۔ پانی کی پاکیزگی کا اندازہ اس کی رنگت، بو اور ذائقہ سے لگایا جاتا ہے۔ وضو کرنے والا آدمی جب ہاتھ دھوئے گا تو اس کو پانی کی رنگت کا پتہ چل جائیگا، جب کلی کرے گا تو ذائقہ کا پتہ چل جائیگا، جب ناک میں پانی ڈالے گا تو بو کا پتہ چل جائیگا۔ جب تینوں طرح سے پانی کی پاکیزگی کا پتہ چل گیا تو شریعت نے چہرہ دھونے کا حکم دیا تاکہ فرض کامل صورت میں ادا ہوجائے۔

(نکتہ ۲) وضو کے اعضاء متعین کرنے میں کیا خصوصیت ہے؟

جواب: حضرت آدم علیہ السلام سے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی بھول ہوئی، وضو کے ذریعے اس بھول کی یاد دہانی کروائی گئی تاکہ انسان اپنی تمام غلطیوں سے معافی مانگ سکے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے شجر ممنوعہ کا پھل توڑا، آنکھوں سے دیکھا، منہ سے کھایا، پتوں کو سر لگا، پاؤں سے اس کی طرف چل کر گئے۔ وضو کرتے وقت اس بھول کی یاددہانی کروائی گئی، تاکہ انسان پچھلے گناہوں سے توبہ کرلے اور آئندہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے۔ یہ سبق بھی دیا گیا کہ اگر میرے حکموں کے مطابق زندگی گزاروگے تو نعمتوں میں پلتے رہوگے، جنت میں جاسکوگے۔ اور اگر شیطان کی پیروی کروگے تو نعمتوں سے محروم کردیئے جاؤگے، جنت میں داخلہ

نصیب نہ ہو سکے گا۔

(نکتہ ۳) وضو میں ہاتھ دھونے سے ابتداء کیوں کی گئی؟

جواب تاکہ موت کے وقت مال سے ہاتھ دھونے پڑیں گے تو دل کو رنج نہ ہو۔ مزید برآں انسان کے ہاتھ ہی سب سے زیادہ مختلف جگہوں یا چیزوں سے لگتے ہیں۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ ہاتھوں پر مختلف بیکٹیریا یا اور جراثیم لگے ہوئے ہوں۔ ہاتھ پہلے دھونے سے وہ گندگی دور ہو جائے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان دوسرے اعضاء کو ہاتھوں ہی کی مدد سے دھوتا ہے اگر ہاتھ ہی پاک نہ ہوں تو دوسرے اعضاء کیسے پاک ہوں گے، اس لیے وضو میں ہاتھ پہلے دھلوائے گئے باقی اعضاء کو بعد میں دھویا گیا۔

(نکتہ ۴) وضو میں چار فرض کیوں ہے؟

جواب وضو میں چار فرض ہیں۔ دو اعضاء ذرائع علم میں سے ہیں مثلاً سر اور چہرہ، جبکہ دو اعضاء ذرائع عمل میں سے ہیں مثلاً ہاتھ اور پاؤں۔ ان چاروں کو دھونا فرض قرار دیا گیا۔ گویا یہ طے شدہ بات ہے کہ تمام سعادتوں کی بنیاد علم پر عمل کرنے میں ہے۔

(نکتہ ۵) تیمم میں دو فرض کیوں ہیں۔

جواب تیمم اس وقت کرتے ہیں جب پانی موجود نہ ہو یا بیماری کا عذر ہو۔ پس عذر کی حالت میں عمل میں تخفیف کی گئی، انسان پر بوجھ کم کر دیا گیا، رخصت مل گئی، عمل کرنے میں آسانی ہوگئی۔ رہی بات یہ کہ چار میں سے دو کون سے چنے گئے۔ تو ایک عضو ذرائع علم میں سے چنا گیا مثلاً چہرہ اور سر میں چہرہ کو منتخب کیا گیا، وجہ یہ تھی کے سر کا تو پہلے ہی چوتھائی حصہ کا مسح کرتے ہیں جبکہ چہرہ کامل دھویا جاتا ہے۔ پس کامل کو ترجیح دی گئی البتہ ذرائع عمل میں سے ہاتھ اور پاؤں میں سے ہاتھوں کو چنا گیا۔ چونکہ ہاتھ پاؤں سے اعلیٰ ہیں۔ شریعت نے کامل اور اعلیٰ اعضاء کو چن لیا، بقیہ کا بوجھ کم کر دیا۔

(نکتہ ۶) تیمم میں سر کو کیوں نہ چنا گیا؟

جواب وضو میں پہلے ہی چوتھائی سر کا مسح کیا جاتا ہے، جب معافی دینی تھی تو پورے سر کا مسح معاف کر دیا گیا۔ ویسے بھی جہلاء کی عادت ہوتی ہے کہ مصیبت کے وقت سر پر مٹی ڈالتے ہیں تو تیمم میں سر کا مسح معاف کردیا گیا تاکہ جہلاء کے عمل سے مشابہت نہ ہو۔

(نکتہ ۷) تیمم میں ہاتھ اور چہرے کو دوسرے اعضاء پر مقدم کیوں کیا گیا؟

جواب انسان اکثر گناہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے ذریعے کرتا ہے۔ اس لیے ان کا انتخاب ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن دو اعضاء پر خوف زیادہ ہوگا۔ ایک چہرے پر کہ گنہگاروں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ ”يَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ۔“ (آل عمران، ۱۰۶) جس دن سفید ہونگے بعض چہرے اور سیاہ ہونگے بعض چہرے۔ کفار کے چہرے کالے اور مٹی آلود ہونگے ”وَوُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ عَلَيۡهَا غَبَرَةٌ۔ تَرۡهَقُهَا قَتَرَةٌ۔ اُولٰٓئِكَهُمُ الۡكَفَرَةُ الۡفَجَرَةُ۔“ (سورہ عبس) اور کتنے منہ اس دن گرد آلود ہونگے۔ چڑھی آتی ہے ان پر سیاہی۔ یہ لوگ وہی ہیں جو منکر اور ڈھیٹ ہیں۔ دوسرا پل صراط سے گزرتے ہوئے بعض لوگوں کے پاؤں کانپ رہے ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔ ”وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا، كَانَ عَلٰي رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا“ (سورہ مریم، ۷۱) اور کوئی نہیں تم میں جو نہ پہنچے گا اس پر۔ تیرے رب پر یہ وعدہ لازم اور مقرر ہو چکا، بچائیں گے ہم انکو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اس میں اوندھے گرے ہوئے۔

وضو کے فوائد سائنسی نکتہ نظر سے!

دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنے میں سائنسی نکتہ نظر سے بہت زیادہ جسمانی فوائد ہیں۔ درج ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

(۱) ہاتھ دھونا۔ کام کاج کے دوران انسان کے ہاتھ بعض ایسی اشیاء پر لگتے ہیں جن پر بیکٹیریا یا اور دوسرے جراثیم لگے ہوتے ہیں وہ جراثیم ہاتھوں سے چمٹ جاتے ہیں جب انسان کے ہاتھ اپنے جسم کے مختلف حصوں سے لگتے ہیں تو وہ جراثیم وہاں منتقل ہوجاتے ہیں اور مختلف بیماریوں کے پھیلنے کا باعث بنتے ہیں نمازی انسان دن میں کم از کم پانچ مرتبہ اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھوتا ہے لہذا اس کے ہاتھ صاف ستھرے رہتے ہیں۔ بہت سے بیماریوں سے بچاؤ خود بخود ہوجاتا ہے۔

(۲) کلی کرنا۔ انسان جب کوئی چیز کھاتا ہے تو دانتوں کے درمیانی جگہوں میں اس کے اجزاء پھنس جاتے ہیں۔ اگر منہ کو اچھی طرح صاف نہ کیا جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اجزاء گل سڑ جاتے ہیں، منہ سے بدبو آنی شروع ہوجاتی ہے، اگر دوبارہ کھانا کھایا جائے تو یہ گندے اجزاء صاف کھانے کے ساتھ ملکر معدے میں پہنچ جاتے ہیں اور پیٹ کی بیماریوں کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وضو کرنے والا انسان دن میں پانچ مرتبہ اپنے منہ کو اچھی طرح صاف کرتا ہے لہذا دانتوں اور آنتوں کی بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔

(۳) ناک میں پانی ڈالنا۔ انسان کے پھیپھڑوں میں ہوا کا جانا اور آکسیجن کا جسم کو مہیا ہونا انسانی زندگی کا سبب ہے۔ ہوا میں مختلف جراثیم اربوں کھربوں کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں اللہ تعالی نے انسان کے ناک میں بال اگا کر ائیر فلٹر بنادیا تاکہ صاف ہوا جسم کو ملے ۔ جس طرح گاڑیوں کے ائیر فلٹر کچھ عرصے کے بعد چوک ہوجاتے ہیں ان کو صاف کرنا پڑتا ہے اسی طرح انسان کے ناک میں مختلف جراثیم اکٹھے ہوجاتے ہیں، ناک کو بار بار صاف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی بھی انسان اپنے ناک میں دن میں ایک دو مرتبہ سے زیادہ پانی ڈال کر صاف نہیں کرتا ہوگا مگر ایک مسلمان نمازی دن میں پانچ مرتبہ اپنے ناک کی پانی سے صفائی کرتا ہے۔

(۴) چہرہ دھونا

وضو کے دوران چہرہ دھونا فرض ہے ۔ جب چہرہ دھویا جاتا ہے تو اس کی جلد صاف ہوجاتی ہے، مسام کھل جاتے ہیں، تروتازگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ مزید برآں چہرہ دھوتے وقت آنکھوں میں پانی کا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ آنکھوں کے ماہرین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دن میں چند بار آنکھوں میں تازہ پانی کے چھینٹے مارے جائیں تو آنکھیں کئی بیماریوں سے محفوظ ہوجاتی ہیں ، خاص طور پر صبح کے وقت جب کہ ہوا میں اوزون (O 3) کافی مقدار میں موجود ہوتی ہے پانی کے چھینٹے آنکھوں میں مارنے سے انسان موتیا بند کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے ۔

(۵) گردن کا مسح کرنا۔ انسانی دماغ سے نکلنے والی چھوٹی چھوٹی رگیں (نرو) پورے جسم میں پھیل جاتی ہیں اور مختلف اعضاء کو سگنل پہنچانے کا کام کرتی ہیں ۔ یہ سب رگیں دماغ سے نکل کر گردن کے پیچھے سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی کے ذریعے جسم کے مختلف جگہوں سے ملی ہوتی ہیں ۔ گردن کے پیچھے کا حصہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اگر اس حصہ کو خشک رکھا جائے تو رگیں کھنچنے کی وجہ سے انسانی دماغ پر اس کا اثر پڑتا ہے، کئی لوگ تو دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں، ڈاکٹر لوگ انہیں سمجھاتے ہیں کہ وہ گردن کے پیچھے کے حصے کو وقتاً فوقتاً تر کرتے رہیں ۔ نمازی آدمی جب وضو کرتا ہے تو اسے یہ نعمت خود بخود مل جاتی ہے۔

ایک شخص فرانس کے ائیر پورٹ پر وضو کررہا تھا اس سے کسی نے پوچھا کہ آپ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں اس نے کہا پاکستان سے ۔ سائل نے پوچھا کہ پاکستان میں کتنے پاگل خانے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے تعداد کا پتہ نہیں ویسے چندایک ہی ہوں گے ۔ سائل نے اپنا تعارف کروایا کہ میں یہاں کے ایک پاگل خانے کے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں، میری پوری عمر اس تحقیق میں گزری ہے کہ لوگ پاگل کیوں ہوتے ہیں؟ میری تحقیق کے مطابق جہاں اور بہت ساری وجوہات ہیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنے گردن کے پچھلے حصے کو خشک رکھتے ہیں، کھچاؤ کی وجہ سے رگوں پر اس کا اثر ہوتا ہے، جو لوگ اس جگہ کو وقتاً فوقتاً نمی پہنچاتے رہیں وہ پاگل ہونے سے بچ جاتے ہیں میں نے دیکھا کہ آپ نے ہاتھ پاؤں دھونے کے ساتھ ساتھ گردن کے پیچھے کے حصے پر بھی گیلے ہاتھ پھیرے ۔ نمازی نے بتایا کہ وضو کرتے وقت گردن کا مسح کیا جاتا ہے اور ہر نمازی دن میں پانچ مرتبہ گردن کا مسح کرتا ہے ۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ اسی لیے آپ کے ملک میں لوگ کم تعداد میں پاگل ہوتے ہیں ۔ اللہ اکبر! ایک ڈاکٹر کی پوری زندگی کی تحقیق نبی ﷺ کے بتائے ہوئے ایک چھوٹے سے عمل پر آکر ختم ہوگئی ۔

(۶) پاؤں دھونا ۔ انسانی جسم میں بعض ایسی بیماریاں ہوتی ہیں جن کا اثر پاؤں پر بہت زیادہ ہوتا ہے مثلاً شوگر کے مریض کے پاؤں پر زخم بھی ہوجائیں تو اسے پتہ نہیں چلتا ۔ ڈاکٹر لوگ شوگر کے مریض کو سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں کو صاف رکھیں ۔ دن میں چند مرتبہ اسے غور سے دیکھیں کہ کہیں کوئی زخم وغیرہ تو نہیں ۔ اچھی طرح پاؤں کا مساج کرے تاکہ خون کی شریانوں میں اگر کہیں رکاوٹ ہے تو وہ دور ہوجائے ۔ نمازی آدمی دن میں پانچ مرتبہ وضو کرتا ہے تو یہ سب کام خود بخود ہوجاتے ہیں، پاؤں کی انگلیوں کے درمیان فنگس کی وجہ سے زخم ہوجاتے ہیں وضو کرنے والا انگلیوں کے درمیان خلال کرتا ہے تو اسے صورتحال کا پتہ چل جاتا ہے ۔ پاؤں زمین کے قریب ہونے کی وجہ سے بہت جلد جراثیم کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، انہیں صاف رکھنا اور متعدد بار دھونا بہت ضروری ہے، یہ نعمت نمازی کو وضو کے دوران نصیب ہوجاتی ہے ۔ اسے کہتے ہیں ہیں ''ہم خرما و ہم ثواب'' کہ وضو کرنے سے گناہ بھی جھڑ گئے اور جسمانی بیماریوں سے بھی نجات مل گئی ۔

وضو کے ان فضائل، معارف اور فوائد و ثمرات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ ربّ العزّت نے وضو کا حکم فرما کر ہمارے اوپر کس قدر احسان فرمایا ۔۔

زبان کی حفاظت پر جنت کی ضمانت

مفتی محمد جمال الدین قاسمی

جسے اپنی زبان پر قابو نہ ہو، اسے ندامت وپشیمانی سے دوچار ہونا پڑے گا
اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہوجائیں گے

جسم کے لحاظ سے اگر چہ حقیر وچھوٹی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے صادر ہونے والے کلمات کی تاثیر بہت دور رس ہوتی ہے، اسی زبان سے جب کفر وشرک میں لت پت انسان کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے تو جنت جیسی سدا بہار نعمت کا مستحق ہوجاتا ہے اور یہی وہ زبان ہے کہ جب کوئی پشتی مسلمان بھی اس سے کفریہ کلمات نکال دیتا ہے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوجاتا ہے، مگر عام طور پر لوگ اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں اور سوچے سمجھے بغیر اس کا استعمال کرتے رہتے ہیں، جب کہ اس زبان سے عموماً جھوٹ، غیبت، بہتان، پردہ دری، خودستائی، لغوگوئی، ایذا دہی، چغلخوری، فحش گوئی، خودنمائی اور ریاکاری جیسے عیوب بھی صادر ہوا کرتے ہیں، چونکہ زبان کو حرکت دینے میں نہ کوئی تکلیف ہوتی ہے نہ مشقت، نہ اس سے تعب لاحق ہوتا ہے نہ ہی تھکن، بلکہ بولنے میں اور لذت محسوس ہوتی ہے، خودطبیعت بھی بولنے پر اکساتی رہتی ہے ادھر شیطان بھی کچوکے لگاتا رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں نہ جانے اس کی زبان کی زد میں انسانوں کے اور خود خدائے تعالیٰ کے کتنے حقوق ضائع ہوتے رہتے ہیں اور اسے احساس بھی نہیں ہو پاتا، انسان محض زبان کی وجہ سے جن آفتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے اس کی تعداد امام غزالیؒ نے باتفصیل بیس بیان کی ہیں، ان تفصیلات کو پڑھ کر ایک حساس دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو ان کو زبان کھینچتے ہوئے دیکھا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اللہ آپ پر رحم فرمائے! اسے چھوڑ دیجئے، حضرت ابوبکرؓ نے جواباً فرمایا: اسی نے تو مجھے بہت سے مہلکات میں ڈال رکھا ہے (مشکوۃ: ۴۱۵)

حضرت معاذ بن جبلؓ نے حضور اکرم سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! جو کچھ ہم بولتے ہیں اس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اے ابن جبل! تیری ماں تجھے روئے، دوزخ میں لوگوں کو اپنی زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے بھی ڈالا جائے گا (ترمذی: ۸۹/۲) حضرت عبداللہ بن ثقفیؓ نے عرض کیا: آپ ﷺ میرے متعلق سب سے زیادہ کس چیز سے خائف ہیں؟ آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر فرمایا: اس سے (مشکوۃ: ۴۱۳) سعید بن جبیرؒ آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جب آدمی صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلسلے میں اللہ سے ڈرنا، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہوجائیں گے (ترمذی: ۶۶/۲) ایک جگہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کا کلام زیادہ ہوتا ہے اس کی لغزشیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور جس کی لغزشیں زیادہ ہوتی ہیں تو گناہ بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جس

کے گناہ زیادہ ہوتے وہ آگ کا زیادہ مستحق ہوتا ہے (بیہقی) فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ زبان کی حفاظت کیا کرئے، نیز وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص زبان کو اپنے قابو میں رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتا ہے (تنبیہ الغافلین: ۹۷) لقمانِ حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: جسے اپنی زبان پر قابو نہ ہو، اسے ندامت وپشیمانی سے دوچار ہونا پڑے گا (ص: ۸۰) بعض صحابہ کرامؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب کوئی اپنے دل میں سختی پائے، بدن میں سستی اور رزق میں بے برکتی دیکھے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ لایعنی گفتگو کی سزا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ کے ذکر کے سوا دیگر باتوں میں اپنے آپ کو مشغول نہ رکھا کرو، اس سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے اور جس کے دل میں سختی جاتی ہے وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے، لیکن اسے احساس تک نہیں ہو پاتا (ص: ۸۲) ایک حدیث میں ہے کہ انسان کلمہ خیر اپنی زبان سے تو نکالتا ہے، مگر اس کی عظمت واہمیت سے وہ ناواقف ہوتا ہے، حالانکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے درجات میں اضافہ فرما دیتا ہے اور کبھی اسی زبان سے کلمہ شر نکل جاتا ہے، جس کی نزاکت کا اسے احساس نہیں ہو پاتا، حالانکہ وہ اللہ کی ناراضی کا سبب ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اسے جہنم کا مستحق قرار دے دیا جاتا ہے (مشکوۃ: ۴۱۲) یہ اور ان جیسی دیگر روایات سے حفاظت زبان کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ قلیل الحجم ہونے کے باوجود اس کا استعمال کس قدر نازک ہے۔

امن کی خواہش درست!

دریائے فرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی پیاس سے ہلاک ہوگیا تو عمرؓ بن الخطاب اس کا ذمہ دار ہوگا۔ خلافت عثمانیہ میں عشروں اصول رہا کہ پرندوں کے لیے برفیلے پہاڑوں پر دانہ پھینک دیا جاتا تھا، گویا ریاست اسلامی روزی روٹی اور رہائش کا خیال رکھنا اپنے ذمے سمجھتی ہے۔ اسلامی فلاحی ریاست غیر مسلم بوڑھوں اور معذوروں تک کے وظائف مقرر کر دیتی ہے۔ ترقی کے وہ تمام اصول جو قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے ان پر عمل پیرا ہونا اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ المختصر ان تمام پہلوؤں کو زیر بحث لانے کا مقصد یہی ہے کہ آپ بدامنی کے اسباب کو سمجھیں اور امن کی وسیع وعریض شاہراہوں کو پہچانیں، جہاں امن اور ترقی کے تمام پہلو روشن ہی نہیں یقینی بھی ہیں۔ مغرب اور امریکہ بھی ترقی کے تمام زینے چڑھنے کے بعد بھی خوف اور بے چینی کی دلدل میں کھڑا نظر آ رہا ہے۔ وہ ترقی بیکار اور بے سود ہے جو آپ سے خوف کو دور نہ کر سکے اور امن وسکون کو یقینی نہ بنا سکے۔ لہذا حقیقت کو سمجھئے! بہترین قیادت منتخب کریں اور بہترین اعلیٰ وارفع نظام کو قبول کریں۔ ورنہ امن کی یہ خواہش ہمیشہ ایسا خواب ہی رہیگی جس کی کوئی تعبیر نہیں ہوگی۔ ہماری دنیاوی اور اخروی زندگی کی کامیابیوں کی ضمانت عبادات و معاملات میں آسمانی ہدایات کی پاسداری میں ہی ہے۔

اللہ پاک ہمیں روشن مستقبل اور پرامن وبے خوف مستقبل نصیب فرمائیں۔

آمین یارب العالمین

مغرب کا فکری اتار چڑھاؤ اور راہِ اعتدال!

انسان نے کبھی بھی فطرت سے ہٹے ہوئے کسی نظریہ کو کبھی قبول نہیں کیا۔ یہاں بھی یہ بات یاد رہے کہ اس فلسفۂ زندگی نے جہاں مرد انسان کو متاثر کیا وہاں عورت انسان کو مرد سے کہیں زیادہ متاثر کیا۔ وہ یوں کہ عورت کو اس فلسفہ نے زندگی کے معاملات سے بالکل ہی بے دخل کرنے کی بھرپور کوشش کی جس کے نتیجے میں عورت کو فطرت کے ودیعت کردہ حق سلب ہوکر رہ گئے۔ مثلاً: ترتولیان آئمۂ مسیحت، عورت کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجرِ ممنوع کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی، اور خدا کی تصویر مرد کو غارت کرنے والی ہے۔ کرائی سوسٹم اولیائے مسیحیت میں سے تھا۔ کہتا ہے عورت ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی، ایک آراستہ مصیبت۔ (معاذ اللہ)۔ یہاں عورت کے بارے میں مغربی نکتہ نظر سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ مغرب کا تصور عورت کے بارے میں کبھی اعتدال پر نہیں رہا۔ کبھی عورت کو صرف حیوانی تعلق سمجھا گیا، پھر شیطانی گندگی اور نجاست خیال کیا گیا اور پھر دوبارہ حیوانی تعلق خیال کرلیا گیا۔ (شاید یہ مغرب میں اس گھڑی کے پنڈولم کی حرکت کی وجہ سے ہوتا ہو) یہ تھا مختصر سا خاکہ مغرب کا انسان کے بارے میں انتہا پسند نظریات پر مشتمل جس میں کبھی بھی راہِ اعتدال نہ اپنائی گئی۔ جس طرح مغرب کا نظریہ انسان کے بارے میں ہمیشہ انتہا پسندی اور بے اعتدالی کا شکار رہا اسی طرح مغرب کے معاشی نظام میں بھی ہمیشہ بے اعتدالی پائی گئی۔ (جاری ہے)

تعلیماتِ نبوی ﷺ اور ہماری زندگی

اور ابو جہل نے بھی! ہر مکی اور مدنی قریشی اور اموی گواہی دیتا تھا کہ آمنہ کے نورِ چشم کے دامن سیرت پر جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، ظلم، قطع رحمی، فحش گوئی اور فحش کاری کا کوئی معمولی سا دھبہ بھی ہم نے نہیں دیکھا، نہ نبوت سے پہلے اور نہ نبوت کے بعد اور کہاں ہم جن کی اخلاقی پستی کے دنیا بھر میں چرچے ہیں، نہ ہم دروغ گوئی سے باز آتے ہیں نہ خیانت اور بدعہدی سے، کون سا شعبہ ہے جو جھوٹ سے پاک ہے؟ سیاست سے تجارت تک اور انتظامیہ سے عدلیہ تک کیا ہر جگہ جھوٹ کی نحوست کے اثرات ہمیں دکھائی نہیں دیتے؟

کہاں وہ جنہوں نے مسلمان کے خون کی حرمت یوم عرفہ، بلد حرام اور ماہِ ذوالحجہ کے مساوی بیان فرمائی اور جب غلط فہمی کی بنیاد پر حضرت اسامہؓ کے ہاتھوں چند لمحوں کا مسلمان شہید ہوگیا تو آپ ﷺ تڑپ اٹھے تھے، آسمان کی طرف مبارک چہرہ اور ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ''اے اللہ انہوں نے جو کچھ کیا، میں اس سے بری ہوں''۔

اور کہاں ہم جو اپنے محلوں اور بازاروں میں کلمہ گو بھائیوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں کہیں پانی پلانے پر جھگڑا ہوتا تھا کہیں جانور آگے بڑھانے پر، اب بھی یہی جھگڑے ہیں، زمین کے ٹکڑوں پر پورا پورا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، لگتا ہے جاہلیت کا دور واپس آگیا ہے۔ چودہ سو تیس سال پہلے تعلیمات محمدی کی برکت سے ٹوٹے دل جڑے تھے، آج بھی اس سے بہتر نسخہ کوئی نہیں، شرط ہے اتباع اور عمل کی۔ محض باتیں نہیں، نعرے نہیں، تقریریں نہیں، عمل اور مسلسل عمل۔۔۔

صبر کیا ہے؟

زور سے رونا پیٹنا، چیخنا اور چلانا نوحہ ہے، جو کہ صبر کے خلاف ہے۔ کسی پریشانی کے موقع پر صبر کرنے کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء پر قابو رکھے، زور زور سے نہ روئے، چہرے پر یا جسم کے کسی حصے پر دوہتڑ نہ مارے، دامن نہ پھاڑے، اور زبان سے اللہ تعالیٰ کا شکوہ نہ کرے۔ ان کاموں کے کفر ہونے کا یہ مفہوم نہیں کہ جو شخص یہ کام کرے وہ کافر ہوجاتا ہے یا وہ دین اسلام سے مکمل طور پر خارج ہوجاتا ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو شخص یہ کام کرے یا جس میں یہ خصلت پائی جائے اس میں یہ خصلت کفار کی ہے۔ گویا یہ کفار کا کام ہے، مسلمانوں کا نہیں۔

(۵) گویا صدمہ کے وقت بے صبری اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر رضا مند نہ ہونا کبیرہ گناہ ہے۔ نیکی سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ گناہوں سے ایمان میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ اور ایمان میں کمزوری، توحید میں کمزوری ہوتی ہے اس لیے بے صبری ایمان اور توحید دونوں کے منافی ہے۔

(۶) اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت بیان کی گئی ہے اور یہی حکمت جب بندے کے دل و دماغ میں راسخ ہوجاتی ہے تو وہ صبر کو ایک عظیم قلبی عبادت جانتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے آراستہ پیراستہ کرلیتا ہے اور اللہ کی قضا و قدر پر ناراضی کا اظہار اور شکوہ نہیں کرتا۔ اسی لیے بعض اسلاف کا معمول تھا کہ وہ بیمار نہ ہوتے یا ان پر کوئی آزمائش نہ آتی تو وہ سمجھتے کہ شاید اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہے، اس لیے اس نے مجھے بھلا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ہر ہر حکم کی تعمیل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔۔آمین یا ربّ العالمین!

ذکر حسنین رضی اللہ عنہما

دوشِ نبی کے شاہسواروں کی بات کر
کون و مکاں کے راج دلاروں کی بات کر

جن کے لیے ہیں کوثر و تسنیم موجزن
ان تشنہ کام بادہ گُساروں کی بات کر

خلدِ بریں ہے جن کے تقدس کی سیر گاہ
ان خوں میں غرق غرق نگاروں کی بات کر

کلیوں پہ کیا گزر گئی پھولوں کو کیا ہوا
گلزارِ فاطمہ رضی اللہ عنہ کی بہاروں کی بات کر

جن کے نفس نفس میں تھے قرآں کھلے ہوئے
ان کربلا کے سینہ فگاروں کی بات کر

شمر لعین کا ذکر نہ کر میرے سامنے
شیر خدا کے مرگ شعاروں کی بات کر

(سید شاہ نفیس الحسینی رحمہ اللہ)

اس کے اٹھتے ہی مسلمانوں کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

وصیت ٹیپو سلطان شہیدؒ

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلی بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کہ ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گزار گرمئ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ